ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲۷ / دسمبر ۱۹۹۴ء

☆ سقوطِ ڈھاکہ ہماری اجتماعی غلطیوں کا شاخسانہ تھا
☆ کشمیر کا تنازعہ کیا "ہوائی فائرنگ" سے حل ہو سکتا ہے؟
☆ کراچی میں امن ریلی کے روز بھی لاشیں گر رہی تھیں

حدیثِ امروز

ایک اور "کامیاب" اسلامی سربراہ کانفرنس

مراکش کے شہر کاسابلانکا میں اسلامی سربراہ کانفرنس شان و شوکت کے مظاہرے کے بعد "کامیاب" اختتام کو پہنچی جس کی کامیابی یہ ہے کہ اکیاون مسلم ممالک نے دنیا جہان کے موضوعات پر پچاس قراردادیں پاس کر لیں۔ کشمیر' بوسنیا' عرب اسرائیل امن مذاکرات' عراق اور بیت المقدس کے مستقبل سمیت کونسا مسئلہ ہے جس پر کانفرنس نے امت مسلمہ کے جذبات کو زبان نہ دی ہو لیکن خود ان سربراہوں کو خوب معلوم ہے کہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی۔ پاکستان مسئلہ کشمیر پر ایک قرارداد کی منظوری کو اپنا بہت بڑا کارنامہ قرار دیتا ہے جس کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے دہلی سے اعلان آگیا کہ بھارت اس قرارداد کو مسترد کرتا ہے۔ دوسری قراردادوں کا حشر بھی اس سے مختلف نہ ہو گا کیونکہ ان حکمرانوں کی بات کا وزن ہی کیا ہے جن کے دل و جان بھی غیر کے پاس گروی ہیں اور بدن بھی۔ پھر یہ حقیقت بھی کوئی راز نہیں کہ مسلم ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی اپنے مطالبات کے حق میں کسی عملی اقدام کے لئے تیار نہیں یا اس کی "استطاعت" ہی نہیں رکھتا۔ کشمیر اور بوسنیا کو ہی لے لیجئے جہاں خون مسلم کی ارزانی انتہا کو پہنچ چکی ہے' بھارت اور مشرقی یورپ کی عیسائی قوتوں کو اسلامی سربراہ کانفرنس کی طرف سے اگر یہ دھمکی دی گئی ہوتی کہ ان مسلمانوں کی نسل کشی کا روکا نہ گیا تو پوری دنیا سے مسلمان اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کو پہنچیں گے یا کم سے کم یہ کہ تمام مسلم ممالک ظالموں سے سفارتی و تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے' تو ان قراردادوں میں کوئی وزن ہوتا اور کچھ تاثیر بھی ہوتی۔ ایسی کوئی دھمکی دی ہی نہیں گئی جبکہ دی گئی ہوتی تب بھی اس پر عمل درآمد کی نوبت آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ اکیاون مسلم ممالک جو بدقسمتی سے ایک امت کے اجزا نہیں بلکہ اکیاون قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں' مرکزیت کی ہر ممکنہ شکل سے محروم ہیں۔ او آئی سی جیسی تنظیمیں بھی حکمرانوں کے کلب سے زیادہ کسی حیثیت کی حامل نہیں اور اس "مرکز" کا متبادل نہیں بن سکیں جو امت مسلمہ کی اجتماعی قوت کی علامت ہو۔ ان اکیاون ممالک میں سے بیشتر بے چارے بقول اقبالؔ ترکانِ "جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر "تہذیب" کے پھندے میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کی شکل میں مرکز کا جو ایک ہیولا ہی ۱۹۲۴ء تک قائم تھا' اس کی قباچاک ہونے کے بعد سے نہ طہران اقوام مشرق کا جنیوا بن سکا نہ حجاز نے منصب امامت سنبھالنے کی کوئی سعی کی اور نہ کسی صنم خانے سے کعبے کو نئے پاسباں ملے۔ "قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی" اور جہاں کوئی مرکز ہی نہ ہو؟۔

امت مسلمہ کو درپیش مسائل پر قراردادوں کو تو دنیا زیادہ سے زیادہ دل آویز شعبدہ بازی سمجھے گی' مغرب کی دلچسپی کا اصل باعث مسلم حکومتوں کے سربراہوں کی اس تشویش کو بننا ہے جو "بنیاد پرستوں" کی دہشت گردی پر ظاہر کی گئی اور عجب نہیں کہ ان "شرپسندوں" سے نمٹنے کی کسی مشترکہ اور خفیہ حکمت عملی کے خطوط بھی متعین کر لئے گئے ہوں جن پر بعد میں کوئی کمیٹی تفصیلی لائحہ عمل مرتب کرے۔ ان زعماء کا اصل مسئلہ اب یہی ہے کہ روح مشرق بدن کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ہے اور دنیا بھر میں احیائی تحریکوں نے اسلام کو ان کے لئے ہوّا بنا دیا ہے۔ اسلام خود ان کے اپنے مفادات پر ہی کاری ضرب

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت: ۶ روپے

الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ
(آیت ۲۱۴)

کیاتم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہیں ان لوگوں کے سے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں'

(کہ اے مسلمانو' اگر تم میں سے کسی کا خیال تھا کہ محض زبانی کلامی دعویٰ ایمان ہی کافی ہو گا' اور ابتلاء و آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزرے بغیر ٹھنڈے ٹھنڈے جنت میں داخلہ مل جائے گا تو اسے اس خام خیالی کو ذہن سے نکال باہر کرنا چاہئے۔ ابھی تمہیں ان سخت حالات اور کٹھن مراحل سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تم سے پچھلی مسلمان اقوام کو سابقہ پیش آیا تھا۔ یہ اللہ کی مستقل سنت ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو لازماً آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے۔ یہ ابتلاء و آزمائش سچے اہل ایمان کے ایمان کو مزید نکھارنے کا باعث بنتی ہے اور جن کا ایمان محض نوک زباں تک محدود ہوتا ہے یا جو جھوٹ موٹ کے مدعیان ایمان ہوتے ہیں' آزمائش کی ایک رگڑ ان کے ایمان ک اپردہ چاک کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے ---- خیال رہے کہ مہاجرین تو آزمائش کی بھٹیوں میں سے گزر کر اور ہر قسم کی سختیاں اور صعوبتیں برداشت کر کے گویا صبر و استقامت کے جملہ امتحانات سے گزر کر مدینہ پہنچے تھے لیکن مدینہ کے مسلمانوں نے ابھی آزمائشوں کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ ان آیات کے وقت نزول تک ابھی بدر کا معرکہ بھی پیش نہیں آیا تھا۔ ان کے ایمان کا امتحان تو ابھی لینا باقی تھا۔ ان میں سے جو لوگ آزمائش کے ابتدائی مراحل میں کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہے تھے انہیں گویا پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ عشق و جذب کے بہت سے امتحان تمہاری راہ تک رہے ہیں' ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھرپور ذہنی تیاری کا سامان ابھی سے کرنا ہو گا!)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

ان کو سختیاں اور تکالیف پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی! سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہےO

(سابقہ اقوام میں سے نبیوں اور رسولوں کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کو نہایت شدید حالات اور کٹھن امتحانات سے گزرنا پڑا۔ راہ حق میں انہیں نہ صرف فقر و فاقہ کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں بلکہ ہر نوع کی تکلیف اور اذیت سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ امتحان کی سختی اور مصائب و تکالیف کی شدت جب اپنی اس آخری انتہا کو پہنچی کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان جو ابھی تک صبر و استقامت کے ہر امتحان میں پورے اترے تھے' بے اختیار اللہ کی مدد کی دہائی دینے پر مجبور ہو گئے تب انہیں یہ نوید سنائی گئی کہ گھبراؤ نہیں 'اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے۔ اللہ کی مدد ضرور آتی ہے لیکن پہلے صبر و ثبات اور استقلال و استقامت کا بھرپور مظاہرہ کر کے اس کا استحقاق ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے اگر اہل ایمان کامیابی کے ساتھ گزر جائیں تو یقیناً غیب سے اللہ کی مدد کا ظہور ہوتا ہے اور اہل ایمان کے حق میں حالات بتدریج سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گویا جس کسی نے بھی یہ کہا ہے غلط نہیں کہا کہ ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی)

جوامع الکلم

مومن کا معاملہ کس قدر عجیب اور عمدہ ہے کہ اس کے جملہ امور اس کے لئے خیر و برکت کا باعث ہیں۔ اور یہ فضیلت سوائے مومن کے اور کسی کو حاصل نہیں: اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ چیز اس کے لئے خیر کا موجب ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے حق میں باعث خیر ہے۔

(صحیح مسلم بروایت حضرت صہیبؓ بن سنان)

آج وہ، کل ہماری باری ہے

یوں تو پورے ملک پر داغوں کی بہار آئی ہوئی ہے تاہم کراچی میں جو آئے دن زخموں کے نئے نئے گُل کھلتے رہتے ہیں ان پر دور بیٹھے دردمند تو خون کے آنسو رو ہی سکتے ہیں خود اس شہر کے وہ باسی ذہنی و نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں جو بے حسی کی "دولت" سے محروم ہیں۔ ایک بڑے قومی اخبار نے بڑی دھوم دھام سے نکالی گئی ایک امن ریلی کے ذریعے کراچی کا موسم بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن عین اس روز بھی خون بہا اور اگلے دن ممتاز صحافی محمد صلاح الدین کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا جن کی شہادت کو عام اموات میں شامل نہیں کیا جا سکتا جو آٹھ دس کی اوسط تعداد میں روز کا معمول بن چکی ہیں۔ ملک کے دانا و بینا لوگوں میں بالعموم اور کراچی کے سنجیدہ و فہیم طبقات میں بالخصوص مدیر تکبیر، محمد صلاح الدین کی تحریروں کے قدر دانوں کی کمی نہیں جن کے المناک قتل نے ان سب کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ وہاں عوام کے تو عمل میں ہی انتشار پایا جاتا تھا، اب خواص کی سوچ بھی عدم توازن کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے اور اللہ ہی جانے فکر و عمل کا یہ انتشار سندھ کے حساس ترین علاقوں میں انجام کار کیا قیامت ڈھا کر چھوڑے گا۔

دریں اثناء مولانا؟ عبد الستار ایدھی کے کراچی سے پراسرار فرار اور لندن میں بیٹھ کر اوٹ پٹانگ بیانات کے اجرا نے سنسنی خیزی کی ایک نئی نوع متعارف کرائی ہے جس کے بعد لوگ دور دور کی کوڑیاں لا رہے ہیں۔ حکیم محمد سعید کے قتل کی افواہ نے جو غضب ڈھایا سو الگ۔ عمران خان کانوں کو ہاتھ لگا رہے ہیں کہ میں نے ایدھی صاحب سے جس "پریشر گروپ" کی بات کی تھی اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ تو سماجی خدمات کے حوالے سے ایک بات تھی جس کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہے۔ ایدھی صاحب کو آج تک فرشتے کے روپ میں دیکھا گیا لیکن اسلام آباد کے ایک انگریزی جریدے "پلس" نے ان کی شخصیت پر سے پیاز کے چھلکوں کی طرح اسرار کے پرت اتارتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ حضرت لبنان سے اسرائیل کی گرفت میں آئے اور دو سال یہودیوں کی قید میں رہے ہیں جہاں ان کی "برین واشنگ" کی کوشش بھی ہوئی ہوگی تاہم رہائی اس شرط پر ہوئی کہ آئندہ وہ صیہونی خفیہ تنظیم "موساد" کے لئے کام کریں گے۔ ان پر الزامات تو اور بھی ہیں لیکن یہی ایک کافی نہیں؟۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں۔ دروغ بر گردن راوی، ہم صرف نقل کرنے کے گنہگار ہیں البتہ اتنی بات ضرور سمجھ گئے ہیں کہ ایدھی صاحب اتنے سیدھے نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ اس ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس قیامت کی شدت کا کچھ اندازہ ہو جو کراچی کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں پر ان باتوں کے ردعمل میں گزر رہی ہو گی۔ "اب کسے راہ نما کرے کوئی!"۔

اگرچہ ہماری وزیر اعظمیٰ بے نظیر بھٹو تو اب تک کراچی کی صورت حال کو "معمول کے مطابق" قرار دینے پر مصر ہیں تاہم صدر مملکت فاروق احمد خاں لغاری نے اخباری اطلاعات کے مطابق ایم کیو ایم سے مذاکرات کا آغاز کیا ہے کیونکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کراچی اور سندھ کے دوسرے شہری علاقوں کے مسئلے کے حل کی کلید ایم کیو ایم کے پاس ہے جسے نظر انداز کر کے اس گھمبیر مسئلے کو حل کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ ابھی یہ اندازہ تو نہیں ہوا کہ صدر مملکت کے مذاکرات کس مرحلے میں ہیں اور یہ کہ بے نظیر حکومت نے انہیں صرف درمیانی واسطہ ہی بنایا ہے یا کوئی اختیار بھی تفویض کیا ہے کہ کچھ لینے اور دینے کی بات کر کے قصہ زمین بر سر زمین طے کرنے کی کوشش کریں، تاہم ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو اور ان کے معتمد وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ کا صوبے میں کشتی بحران کی موجودگی اور اس کی نزاکت کا قائل ہونا تو کسی بھی مثبت پیش رفت کے لئے شرط لازم ہے۔ ان دونوں کی بے نیازی کا عالم وہی رہا جس کا مظاہرہ اب تک ہوتا رہا ہے تو صدر مملکت کی سعی رائیگاں گویا صرف وقت گزاری کے لئے ہے جبکہ ہر اگلا لمحہ ہم پر پچھلے سے بھاری ثابت ہو رہا ہے۔

امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے حالات کی سنگینی کو واضح کرنے کے لئے اپنے ایک خطاب جمعہ میں کہا کہ ہماری حالت اس شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں اور وہ دیکھ رہا ہو کہ سیلاب بلا اس کی ناف سے اٹھتا ہوا سینے کو پھلانگ کر سر سے گزرنے والا ہے لیکن وہ صرف بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہنے پر قادر ہے، کر کچھ نہیں سکتا۔ سچ پوچھئے تو اہل کراچی پر یہ تمثیل آج ہی بکمال و تمام صادق آتی ہے، کل ہماری باری ہے۔○○

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۳ شمارہ ۵۰
۲۷ دسمبر ۱۹۹۴ء

24

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقام اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ: ۶/- روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۲۵/- روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۳۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰۰ "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶۰ "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰۰ "

سقوطِ ڈھاکہ ہماری اجتماعی غلطیوں کا شاخسانہ تھا

نثار احمد ملک

قراردادِ لاہور میں ترمیم: ہوش پر جوش کے غلبے کا نتیجہ

دونوں بازوؤں کے درمیان اسلام واحد رشتہ تھا جسے استوار نہ کیا گیا

۱۶ / دسمبر کو منعقد ہونے والے واحد جلسہ عام میں امیر تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کے ناظم اعلیٰ کے خطابات

۱۶ دسمبر پاکستان کی تاریخ کے سیاہ ترین باب کا عنوان ہے۔ پاکستانی قوم بحیثیت مجموعی نسیان کے مرض میں مبتلا ہے جو اس طرح کے دلخراش واقعات کو بھی یکسر بھلا دیا جاتا ہے۔ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو جو عظیم مسلمان ملک معرض وجود میں آیا تھا وہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو دولخت ہو گیا۔ ایک غیر معروف شاعر جناب اشرف آصف کے بقول ؎

جس کی خاطر عصمتوں کی چادریں تک لٹ گئیں
جس کی خاطر ننھے بچوں کا لہو تک بہہ گیا
رہزنوں سے اس وطن کو اب بچا لینا خدا
رہبروں کی سازشوں سے تو وہ آدھا رہ گیا

اس وقت پھر ملکی سلامتی شدید خطرات سے دوچار ہے۔ ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی ناؤ بے یقینی کے منجدھار میں ہچکولے کھا رہی ہے اور کچھ دیر کی بات ہے کہ (خاکم بدہن) ڈوب جائے اور اس کے ساتھ ہی ہم بھی ذلت کی موت مر جائیں یا غلامی کے طوق کو اپنے گلے میں ڈال کر ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔

ملک خداداد پاکستان میں سینکڑوں چھوٹی بڑی سیاسی جماعتیں اور مذہبی گروہ موجود ہیں۔ ان سب کی دلچسپی کشمکش اقتدار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انہیں مغربی جمہوریت اور سیاست کے گھناؤنے کھیل سے فرصت ہی کب ہے کہ وہ ملکی سلامتی کے لئے اپنے ماضی کا گہرے غور و فکر سے تجزیہ کرتے ہوئے اپنے حال کو بہتر اور مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے کوئی مثبت لائحہ عمل اختیار کر سکیں۔ رہے ہمارے ملک کے نام نہاد دانشور تو ان کے پاس بھی لکھنے کے لئے بیسیوں چٹ پٹے موضوعات موجود ہیں۔ اللہ بیڑہ غرق کرے زرد صحافت کا کہ جس نے پوری قوم کو فحاشی و عریانی کے سیلاب میں غرق کر دیا ہے کہ کسی کو ملک کے حال اور مستقبل سے کوئی دلچسپی سرے سے ہے ہی نہیں۔ گویا کہ ملک عزیز کا ہر فرد اپنے اپنے مشاغل میں مست ہے۔ ان حالات میں جو لوگ اس ملک کے بہی خواہ ہیں' ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ لہٰذا اس ملکی نقار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سنتا ہے۔

جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ ۱۶ دسمبر ہماری تاریخ کا ایک سیاہ ترین دن ہے۔ اس روز سقوط ڈھاکہ کا سانحہ فاجعہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ تنظیم اسلامی پاکستان و تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام ۱۶ دسمبر بروز جمعہ جناح ہال لاہور میں سقوط ڈھاکہ کی یاد میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ ملک کی موجودہ گھمبیر صورتحال نے ہمیں یہ جلسہ منعقد کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس جلسہ عام کے ذریعہ ہم نے اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کی توجہ حالات کی سنگینی کی طرف مبذول کرانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ ملک کے حالات بتا رہے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کو ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ ہمیں حالات کی سنگینی کا اچانک احساس نہیں ہوا بلکہ تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر سالہا سال سے خبردار کرتے آ رہے ہیں کہ سندھ کی صورت حال کو سنبھالنا چاہو تو ابھی وقت ہے! ان کے اس انتباہ پر بعض نام نہاد دانشوروں نے یہ پھبتی بھی چست کی تھی کہ "اور بھی بہت سے لوگ سندھ کا دورہ کرتے ہیں' انہیں تو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا جو ڈاکٹر اسرار احمد کو نظر آ جاتا ہے۔" لیکن آج بعد از خرابی بسیار سب کو وہی کچھ نظر آ رہا ہے جو قرآن و سنت کی دو آنکھوں سے دیکھنے والے مرد حق ہیں کو کئی سال قبل نظر آ گیا تھا۔ ہمارے ملک کے مذہبی رہنما بھی امیر محترم پر قنوطیت پسند ہونے کی پھبتی کستے رہے ہیں۔ لیکن کیا آج ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ

میں قنوطی ہی سہی اہل رجاء سچ کہنا
کیا تمہیں صبح کے آثار نظر آتے ہیں!

بہرحال امیر محترم مدظلہ نے ۱۹۸۶ء میں "استحکام پاکستان" اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" نامی کتابیں لکھ کر پاکستان کے عدم استحکام کے اسباب اور استحکام کی واحد بنیاد' اسلامی نظام کا نفاذ نیز مسئلہ سندھ کا گہرا تجزیہ پیش کر دیا تھا۔ لیکن ہمارے ارباب سیاست اقتدار کے نشے میں دھت اور مذہبی جماعتیں لیلیٰ اقتدار کے محمل کو چھونے کے لئے سرگرداں رہی ہیں اور تاحال سرگرداں ہیں لہٰذا کسی کو اس طرز توجہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ ہمارے اس طرز تغافل سے وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا۔

۱۶ دسمبر کو ہمارا یہ جلسہ شام چھ بجے شروع ہوا۔ جلسہ کا آغاز حسب روایت تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ یہ سعادت ہمارے رفیق تنظیم قاری مجیب الرحمٰن کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے امیر محترم مدظلہ کے حکم پر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی تلاوت فرمائی اور اپنی خوبصورت آواز سے محفل کو مسحور کر دیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد تحریک خلافت پاکستان کے سیکرٹری جنرل اور آج کی تقریب کے سٹیج سیکرٹری جناب عبدالرزاق نے تعارفی کلمات میں کہا کہ آج کا موضوع واقعتاً ایک دلخراش موضوع ہے۔ ۱۶ دسمبر کو ہمیں اللہ کی سزا کا ایک زبردست کوڑا پڑا تھا لیکن ہم نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ اس اندوہناک اور سیاہ واقعہ کے بعد ہمیں اپنے مستقبل کی فکر دامن گیر ہو جانی چاہئے تھی جو بدقسمتی سے نہ ہوئی!

محترم عبدالرزاق صاحب نے تعارفی کلمات کے بعد تحریک خلافت پاکستان کے ناظم اعلیٰ اور سقوط مشرقی پاکستان کے چشم دید گواہ جنرل (ر) محمد حسین انصاری صاحب کو دعوت خطاب دی۔ محترم جنرل انصاری صاحب نے اپنی گفتگو کے موضوع کا تعین کرتے

ہوئے فرمایا کہ مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ مشرقی پاکستان ہم سے کیوں جدا ہوا یا دوسرے الفاظ میں مشرقی پاکستان کو ہم نے کیسے کھویا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ موضوع اس لئے منتخب کیا ہے کہ انسانی شعور یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنے ماضی پر نظر رکھ کر اپنے حال کو بہتر بنائے اور اس کا بہتر حال اس کے بہتر مستقبل کی ضمانت دے۔ جنرل انصاری صاحب نے فرمایا کہ تاریخ سے عبرت پذیری کے اس پہلو کو خود قرآن حکیم نے بھی اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کم و بیش پانچ مقامات پر یہ الفاظ دہرائے ہیں کہ ہماری اس زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرم قومیں کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر گزری ہوئی اقوام کے حالات پر غور و فکر کی اتنی اہمیت ہے تو خود اپنے حالات پر غور و فکر کس قدر اہمیت کا حامل ہو گا۔

محترم جنرل انصاری صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگ اپنے اسلاف میں سے بڑی بڑی شخصیات کے دن مناتے ہیں اور قصیدے یا مرثیے پڑھنے کی اپنی عادت کے مطابق ان کی تعریف و توصیف میں حد اعتدال کو چھوڑتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے بھی ملا دیتے ہیں۔ اسی طرح قومی اہمیت کے حامل ایام بھی منائے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ دن جب کہ ہمیں کوئی بڑی فتح نصیب ہوئی ہو۔ لیکن انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ ۱۶ دسمبر بھی ہماری ہی تاریخ کا ایک دن ہے لیکن اس دن ملکی سطح پر کوئی تقریب منعقد نہیں ہوتی۔ محترم انصاری صاحب نے فرمایا کہ سقوط ڈھاکہ انسانی تاریخ کا اس اعتبار سے ایک انوکھا واقعہ ہے کہ ملک کی اکثریت نے اقلیت سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ میں ایسے تو بے شمار واقعات تلاش کئے جا سکتے ہیں کہ کسی ملک کی اقلیت نے اپنے حقوق کے نام پر کسی اکثریت سے اعلان بغاوت کر دیا ہو لیکن یہ واقعہ تو اپنی مثال آپ ہے!

محترم جنرل انصاری صاحب نے فرمایا کہ یہ ہماری قومی نفسیات بن چکی ہے کہ کامیابی میں تو ہر شخص حصہ دار بنتا ہے لیکن کسی ناکامی کی ذمہ داری کو قبول کرنے کی جرات ہم میں سے کسی میں نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانے کے عادی ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے کہا کہ بہت سے لوگ تحریک پاکستان کے دوران دی گئی اپنی قربانیاں آئے روز ریکارڈ کراتے رہتے ہیں۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ لوگ جو ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے وہ بھی مسلم لیگ کے کارکن کہلاتے سنے گئے ہیں!!۔

جناب جنرل انصاری نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا کہ عموماً ہمارے عوام اور خواص ہر دو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار بھٹو، فوج اور مجیب الرحمٰن کو ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو انتہائی سطحی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ حادثہ فاجعہ کوئی ایک دن کے واقعات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اپنے پس منظر میں محبتوں کے نفرتوں میں بدلنے کی ایک طویل داستان رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آج ہمارے دانشور مشرقی پاکستان کے حوالے سے مختلف قسم کی لن ترانیاں الاپ رہے ہیں لیکن جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو رہا تھا تو اس وقت ان کی ذہانت و فطانت کو کیا ہو گیا تھا؟۔ اس وقت اس ملک کو بچانے کی تحریک کیوں نہ اٹھی؟ انہوں نے کہا کہ میں ملک کے دانشوروں سے پھر کہتا ہوں کہ ملک کی سنگینی ہمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ غور کرو اور ہوش کے ناخن لو، تم ایک دفعہ پہلے بھی ڈسے جا چکے ہو! ہمیں سوچنا ہو گا کہ ماضی میں ہماری کن غلطیوں کے سبب بھائی چارہ بٹوارے میں تبدیل ہوا۔

جناب انصاری نے بنگلہ دیش کے لوگوں کے تخلیق پاکستان کے شاندار کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مشرقی پاکستان کا کردار مغربی پاکستان سے کہیں زیادہ فعال تھا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مرکزی اسمبلی کی ۱۱۹ سیٹوں میں سے ۱۱۳ سیٹیں مسلم لیگ نے جیت لی تھیں۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کے مخالفین میں سے ۹۵ فیصد کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں۔ صوبائی اسمبلی کی کل نشستوں میں سے صرف ۱۹ کانگریس کے حصے میں آئیں۔

جنرل صاحب نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ایوب دور میں مشرقی پاکستان میں صنعت و تجارت کو فروغ ملا لیکن اس بظاہر خوش آئند بات کا منفی پہلو یہ تھا کہ تجارتی اور کاروباری مراکز کا کنٹرول مغربی پاکستان کے ہاتھ میں تھا۔ مغربی پاکستانیوں کی مشرقی پاکستان میں بود و باش بھی ان کے لئے اذیت بخش تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مشرقی پاکستان میں کچھ کالونیاں ایسی تھیں کہ جو مغربی پاکستانی سرمایہ داروں کے لئے مختص تھیں۔

جنرل انصاری ۷۰ء کے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ یحییٰ خان نے کم از کم مشرقی پاکستان میں انتخابات انتہائی آزادانہ اور منصفانہ کرائے لیکن اس خوش آئند بات کا بھی ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ ان پر عمل نہ کرا سکا۔ ان واقعات اور عوامل نے باہمی اعتماد کو شدید ٹھیس پہنچائی اور آنے والے ہر دن محبت نفرت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

تصویر کا یہ رخ دکھانے کے بعد جنرل انصاری نے چشم دید واقعات کے آئینے میں تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا کہ جب مشرقی پاکستانیوں کی مغربی پاکستانیوں سے نفرت اپنے جوبن پر تھی اور مغربی پاکستانی، مشرقی پاکستانیوں کے پوری طرح زیر عتاب آ چکے تھے۔ جنرل صاحب بتا رہے تھے کہ فوجیوں کی گاڑیاں عوامی لیگ کے کارکن روکتے اور کہتے تھے کہ کہو "جے بنگال"۔ جنرل صاحب کہتے ہیں کہ اس اذیت ناک صورت حال سے خود مجھے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مغربی پاکستان کی خواتین مشرقی پاکستان میں باہر نہ نکلتی تھیں۔ فوجی جنرلوں کو راستے تبدیل کر کے اپنے ہیڈ کوارٹرز تک جانا پڑتا۔ ان واقعات سے اندازہ ہوتا تھا کہ شائد شیخ مجیب الرحمٰن یکطرفہ طور پر آزادی کا اعلان کر دے۔ چنانچہ جب یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں مذاکرات کے لئے اجلاس طلب کیا تو مجیب الرحمٰن کی کار پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لیکن یحییٰ خان سمیت کسی کو جرات نہ ہوئی کہ اس سے پوچھ سکتا کہ تم نے یہ اعلان بغاوت کیوں کیا ہے!۔

جنرل انصاری نے "مکتی باہنی" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پاکستانی فوج کے وہ مشرقی پاکستانی فوجی تھے جو بغاوت کر چکے تھے۔ جنرل صاحب فرما رہے تھے کہ ۲۵ مارچ کے ایکشن کے بعد حالات کچھ سنبھل گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع دیا کہ اب بھی اگر چاہو تو حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان حالات سے بھارت نے خوب فائدہ اٹھایا چنانچہ بھارتی سیکورٹی فورس (B.S.F) کے ہزاروں فوجی مشرقی پاکستان میں گھس آئے اور مشرقی پاکستانیوں نے انہیں پناہ دی۔

جنرل صاحب نے اس وقت کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت بھی ایسے سنگ دل پاکستانی موجود تھے جو لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایئرپورٹ پر ٹکٹیں بلیک میں فروخت کر رہے تھے۔

جنرل انصاری صاحب نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ مسائل بندوق کی گولی سے کبھی حل نہیں ہوتے۔ یہ گولی دشمن کے سینے پر تو سجتی ہے لیکن اپنے ہم وطنوں کے سینے پر نہیں سجتی بلکہ ایک کے

'Fall of Dacca result of collective mistakes'

By Our Staff Reporter

LAHORE–Amir Tanzeem-e-Islami Dr Israr Ahmad has said the fall of Dacca was the result of our collective mistakes and a punishment from Allah for not enforcing Islamic Shariah in the country.

Addressing a meeting held in connection with the Fall of Dacca Day, on Friday evening at Jinnah Hall, he said: "We had not learnt any lesson from Fall of Dacca and the present socio-economic circumstances of the country are hundred times worst than that of 1971". He said as a nation we had not set our priorities and corruption, vulgarity and fraud had become the order of the day, adding that the more influential person is more corrupt and dishonest in the society.

He said the Shariah could not be enforced in the country due to the international pressure and it was the result of this pressure that Nawaz Sharif could not enforce Shariah despite having two-third majority in the Assembly. He said we were helpless before the economic policies of the IMF and World Bank.

He argued that the main reasons behind the separation of East Pakistan were the non-implementation of promised Islamic order after the creation of Pakistan, enforcement of western, secular democracy, imposition of Urdu as national language on Bangalis, shifting of capital from Karachi to Islamabad and imposition of martial law. He said if President Ayub had held referendum in East Pakistan to know either Bangalis wanted to live with West Pakistan or not and if Yahya Khan had not abolished One Unit, the Fall of Dacca could be avoided.

He said Arabic should have been declared as national language of the country. The Sindhis did not accept Urdu as their national language, he added.

General (Retd) M.H. Ansari said the situation in the country was almost similar to that of 1971 in East Pakistan. He advised the rulers to come to their senses otherwise we might be deprived of our independence.

Dr Israr Ahmad addressing a seminar on 'Fall of Dacca' held under the auspices of Tehrik Khlafat at Jinnah Hall. Maj-Gen (Retd) H.M. Ansari and Rehmatullah also seen–Staff photo.

سینے سے پار ہوتی ہے تو ہزاروں سینے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ان چھلنی ہونے والے سینوں میں محبت کی جگہ نفرت بس جایا کرتی ہے۔ جنرل صاحب نے کہا کہ آج بھی ہمیں روٹھے ہوئے بھائیوں سے پوچھنا چاہئے کہ تم کیوں ناراض ہو؟ اور پھر انہیں راضی کرنا چاہئے اور ان کی شکایتوں کو دور کرنا چاہئے۔ اس وقت نفرت کی بڑھتی ہوئی خلیج کو فوری طور پر کم کرنے کی ضرورت ہے۔

جنرل انصاری صاحب مشرقی پاکستان کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے اس قدر آبدیدہ ہو گئے کہ چند لمحات کے لئے وہ اپنی گفتگو بھی جاری نہ رکھ سکے۔ یہی کیفیت پوری محفل پر طاری ہو گئی۔ کاش اللہ ہمارے ارباب سیاست کو اقتدار کی کشمکش سے بلند تر ہو کر سوچنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ ملک کے اس بہی خواہ بوڑھے کے آنسوؤں سے کوئی سبق حاصل کر سکیں۔ بہرحال جنرل انصاری کی طرف سے اقبال کی زبان میں یہی کہوں گا کہ ۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

جنرل انصاری صاحب کے اثر انگیز خطاب کے بعد اس جلسہ کے صدر' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد کو دعوت خطاب دی گئی۔ امیر محترم مدظلہ نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ سقوط ڈھاکہ دنیا کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی عیسوی میں امت مسلمہ کو دو عظیم شکستوں سے دوچار ہونا پڑا جن میں سے ایک ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ' جو اس امت کے افضل ترین حصے یعنی "امین" کے کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا بنی اور دوسری عظیم شکست کا سامنا ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو کرنا پڑا' جو گویا کہ "آخرین" یعنی غیر عرب مسلمان امت کے چہرے پر بدنما داغ ہے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اگرچہ پاکستان کو اپنے قیام کے بعد سے کئی ایک سانحات سے دوچار ہونا پڑا لیکن ۱۹۷۱ء کی عبرت ناک شکست پاکستان کی قومی تاریخ میں سب سے بڑا سانحہ ہے۔

دنیا میں جو اس طرح کے حوادث وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کے کچھ قرآنی اصول ہیں۔ امیر محترم مدظلہ نے ان قرآنی اصولوں کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اس اصول کو پانچ مرتبہ دہرایا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ حقیقت میں یہ واقعات بندوں کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ کوئی بھی قوم اس طرح کے حادثات سے چند لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے دوچار نہیں ہوتی۔ افراد کے جرائم پر اللہ تعالیٰ اتنی بڑی سزا نہیں دیا کرتا۔ اس طرح کے حادثات سے کوئی قوم تب دوچار ہوتی ہے کہ جب اس کی عظیم اکثریت جرائم میں مبتلا ہوتی ہے۔ جب اللہ سزا دیتا ہے تو پھر گندم کے گیہنوں بھی پس جاتے ہیں۔ افراد کی وجہ سے اللہ سزا نہیں دیتا لیکن کچھ لوگ

ایسے سانحات کے حوالے سے نمایاں ضرور ہو جاتے ہیں۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ سزا فوری طور پر نہیں دیا کرتا بلکہ پہلے اصلاح احوال کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا پانچواں مستقل اصول یہ ہے کہ جب کوئی قوم اس جرم کا اعادہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنت کا اعادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ امیر محترم نے اس موقع پر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸ کا حوالہ دیا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "عسی ربکم ان یرحمکم وان عدتم عدنا" اور یہ تو دنیا کی سزا ہے' اس کے علاوہ "وجعلنا جھنم للکفرین حصیرا" کے مطابق آخرت کا عذاب اس سے بھی شدید تر ہو گا۔

امیر محترم نے ان حادثات کے حوالے سے قرآنی اصولوں کو بیان کرنے کے بعد سقوط ڈھاکہ کے سانحہ فاجعہ کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی اور گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا کہ وہ اسباب اس وقت بھی اسی طرح موجود ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ہماری قیادت عظمیٰ کی پہلی عظیم غلطی یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا' میں ترمیم کر کے ۱۹۴۶ء میں "States" کے لفظ کو "State" میں بدل کر بنگال کو پاکستان کا حصہ بنا لیا گیا۔ حالانکہ مشرقی پاکستان ہمارا فطری حصہ نہ تھا' اس لئے کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کی مسافت موجود تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ درمیان میں بھارت جیسے دشمن ملک کا علاقہ بھی موجود تھا۔ اگر اس وقت دو الگ الگ ملک معرض وجود میں آ جاتے تو بھارت جو کہ دونوں کا حریف ہوتا' کے مقابلے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرتے اور یہ بات دونوں کی قربت کا سبب بنتی۔ بعد ازاں دونوں ممالک ایک کنفیڈریشن کے ذریعے متحد بھی ہو سکتے تھے اور اس کنفیڈرل نظام کو آسانی سے ختم بھی کیا جا سکتا تھا اور اگر دونوں ممالک چاہتے تو دیر تک برقرار بھی رکھا جا سکتا تھا۔ دنیا میں اس کنفیڈریشن کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں' جن میں سے ایک مصر اور شام کی کنفیڈریشن تھی جسے دونوں ممالک نے باہمی رضامندی سے بغیر کسی فساد کے ختم بھی کر دیا۔ اس کے برعکس ہم نے دونوں حصوں کو ایک ملک کی شکل دی جس سے شکایتیں پیدا ہوئیں۔ ہم جذبات کی رو میں بہہ کر جغرافیائی حقائق کو یکسر نظرانداز کرتے چلے گئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ تاریخ میں جغرافیے کو جذبے نے شکست دی ہے۔

یہاں بھی جذبہ غالب رہا لیکن وہ جذبہ اسلامی تھا جس کی آبیاری نہ کی جا سکی۔ اس کے برعکس ہم نے دنیا کے سامنے سیکولر ریاست کا تصور پیش کیا اور ہماری قیادت عظمیٰ نے پیش کیا' چنانچہ پہلا وزیر قانون ہندو اور پہلا وزیر خارجہ قادیانی ٹھہرا۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد پاس ہوئی جبکہ اس وقت تک جذبات پر اوس پڑ چکی تھی۔ اگر دنیا میں رائج دستوری اصولوں کو بھی مدنظر رکھا جائے تو پاکستان کے لئے کوئی متحدہ دستور بن ہی نہیں سکتا تھا۔ جبکہ ہم نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ اصل پاکستان تو مغربی پاکستان ہے' مشرقی پاکستان تو ایک جزیرہ ہے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی (B.P.C) نے ۱۹۵۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں قرارداد مقاصد کا ذکر تک نہ تھا۔ گویا خالص اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان نہ کرنا ہماری دوسری غلطی تھی۔ یہ اعلان اس لئے نہ ہو سکا کہ مسلم لیگ کوئی جماعت نہ تھی بلکہ تحریک تھی۔

امیر تنظیم اسلامی نے اپنے خطاب میں واضح کیا کہ ہماری تیسری بڑی غلطی اردو کو قومی زبان کا درجہ دینا تھی۔ تحریک مسلم لیگ کے دوران اردو زبان تھی اور اسی کے حق میں نعرے بھی لگے لیکن اس وقت ایک جذباتی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ گویا جذبات حقائق پر غالب تھے۔ جب جذبات ٹھنڈے پڑے تو حقائق کھل کر سامنے آنے لگے۔ چنانچہ قائداعظم کی زندگی میں ہی مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلے پر جھگڑا ہوا اور "بنگلا بھاشا" کے نعرے لگے۔ یہ بنگلا بھاشا کا نعرہ "بنگلا دیش" پر منتج ہوا۔

امیر محترم نے کہا کہ جب اردو زبان کو قومی بنانے کی غلطی کی جا رہی تھی' اس وقت بھی ملک و ملت کے کچھ بہی خواہوں نے' جن میں سر آغا خاں اور سید زاہد حسین مرحوم بھی تھے' عربی زبان کو قومی زبان بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر عربی زبان کو قومی زبان کا درجہ دے دیا جاتا تو یہ سب صوبوں کے لئے یکساں قابل قبول ہوتی اور کسی ایک صوبے میں بولی جانے والی زبان کی بالادستی کا تصور جنم نہ لیتا۔

داعی تحریک خلافت پاکستان نے سانحہ سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں چوتھی غلطی مارشل لاء کے نفاذ کو قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر مارشل لاء کا مطلب فوج کی حکومت ہے اور فوج کی حکومت کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کی حکومت اور مشرقی پاکستانیوں کے نزدیک مغربی پاکستان سے مراد پنجاب تھا' تو گویا مارشل لاء کے معنی پنجاب کی حکومت ٹھہرے۔ امیر محترم نے مارشل لاء کے نفاذ کا سبب یہ بتایا کہ مسلم لیگ کوئی منظم جماعت نہ تھی بلکہ تحریک تھی جبکہ اس کے مقابلے میں کانگریس ایک منظم جماعت تھی لہٰذا چالیس سال بھارت میں حکمران رہی۔ انہوں نے کہا کہ مارشل لاء کے دوران مشرقی پاکستانیوں کے سامنے اعداد و شمار آتے تھے کہ کل آمدن کا کتنے فیصد فوج پہ خرچ ہوتا ہے جو ہم پر حکومت کرتی ہے۔ اس لئے ان کے دلوں میں مغربی پاکستان کے لئے نفرت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

امیر محترم نے پانچویں غلطی دارالحکومت کے کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونے کو قرار دیا۔ جب دارالحکومت تبدیل کیا گیا' اس وقت مخلص مشرقی پاکستانیوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ پاکستان کے ٹوٹنے کا آغاز ہے۔

امیر محترم نے آخری غلطی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ۵۴ء میں معلوم ہو چکا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فضا تبدیل ہو چکی ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش صدر ایوب پاکستان کے ڈیگال بن چکے ہوتے۔ اگر وہ مشرقی پاکستان میں ریفرینڈم کرا دیتے تو اولاً اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ مشرقی پاکستانی' پاکستان کے حق میں ہی رائے دیتے۔ اگر یہ نہ بھی ہوتا تو مشرقی پاکستان سے علیحدگی احسن انداز میں ہو جاتی۔ اس طرح کہ علیحدگی کے باوجود دونوں ممالک بھارت کے مقابلے میں متحد رہتے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے پہلے وزیر خارجہ ڈاکٹر کمال نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ "ہم مسلمان ملک کہلانا پسند نہیں کرتے"۔ گویا یہ ہمارے رویئے کے خلاف ردعمل کی شدت تھی۔

امیر محترم نے کہا کہ دوسرا "کاش" یہ ہے کہ..... کاش نام نہاد جمہوریت نوازوں نے ایوب کو مجبور کر کے اگر تلا سازش کیس نہ ختم کرا دیا ہوتا۔ امیر محترم نے انتہائی افسوس کے ساتھ کہا کہ کاش یحییٰ خان نے مغربی پاکستان کا ون یونٹ ختم نہ کیا ہوتا۔ اگر ون یونٹ برقرار رہتا تو مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر بھی معاملہ طے ہو سکتا تھا۔

امیر محترم نے تاریخی حوالوں سے اور قیادت کی غلطیوں کے تجزیئے سے سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر قرآن حکیم کی تشخیص کو سامنے رکھا جائے تو یہ سانحہ ہماری بدعہدی کی سزا کے طور پر رونما ہوا ہے۔ سورۂ توبہ کی ایک

آیت کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم اللہ سے کئے گئے وعدے سے انحراف کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں اس قوم میں منافقت در آتی ہے۔ اس وقت پاکستانی قوم نفاق عملی اور نفاق باہمی کی دونوں صورتوں میں پوری طرح مبتلا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ "اے اللہ تو ہمیں ہندو اور انگریز کی دہری غلامی سے نجات دے' ہم تیرے دین کا نفاذ کریں گے۔ اللہ نے ہمیں ہماری طلب سے دوگنا بڑا ملک عطا کر دیا۔ لیکن ہم نے اللہ سے کئے گئے وعدے کو یکسر فراموش کر دیا جس کی سزا ہمیں نفاق عمل اور نفاق باہمی کی شکل میں مل رہی ہے۔

امیر محترم نے سورۂ سجدہ کی آیت نمبر ۲۱ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اسے "عذاب ادنیٰ" یعنی چھوٹا عذاب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابھی تک باقی ماندہ ملک بچا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مصور پاکستان علامہ اقبال نے جس ملک کا حوالہ خطبہ الٰہ آباد میں دیا تھا وہ ابھی تک موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ قمری حساب سے سانحہ مشرقی پاکستان کو ۲۵ سال ہونے کو ایک سال باقی ہے اور جب یہ کوڑا پڑا تھا اس وقت بھی ملک کو قائم ہوئے ۲۵ سال ہوئے تھے۔

امیر محترم مدظلہ نے ملک کو درپیش بیرونی خطرات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان پر امریکی گدھ ہر طرف سے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی سب سے گہری نظر کشمیر پر ہے۔ امریکہ کو سنٹرل ایشیا کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک اسرائیل کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی

امیر محترم مدظلہ نے اپنی تقریر کے آخری حصے میں اس صورت حال کا علاج بھی تجویز فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے اجتماعی توبہ! یہ اجتماعی توبہ تب ہی ہو سکتی ہے کہ ملک کے اندر ایک ایسی منظم جماعت ہو جو منکرات کے خلاف اعلان جہاد کرے اور پاکستان میں نظام خلافت برپا کر دے۔ وہ جماعت پوری دنیا میں نظام خلافت برپا کرنے کی داعی بھی ہو۔

امیر محترم نے فرمایا کہ یہ ملک اس صورت میں بچ سکتا ہے کہ اولاً یہاں قرآن و سنت کی کامل بالادستی پر مبنی دستوری نظام رائج کیا جائے۔ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ اس ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کیا جائے اور پارلیمانی نظام کی ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ یہ صدارتی نظام وفاقی طرز پر ہو اور تمام وفاقی اکائیوں کو مناسب مقام دیا جائے۔ بھارت کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہاں لسانی بنیادوں پر صوبائی نظام چلایا جا رہا ہے۔ ہر صوبے میں متعلقہ زبان چل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تیسرا نقطہ یہ بیان کیا کہ چھوٹے صوبے بنائے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ احساس محرومی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چوتھا نقطہ یہ بیان کیا کہ سرکاری زبان عربی بنائی جائے اور عملی اقدام کے طور پر پرائمری سے عربی کی تدریس لازمی قرار دی جائے۔

امیر محترم نے اپنے خطاب کے بعد سامعین کی طرف سے اٹھائے گئے چند سوالات کے جوابات بھی دیئے۔ سانحہ سقوط ڈھاکہ کی یاد میں ہونے والا یہ جلسہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ جب جنرل انصاری صاحب نے مائیک سنبھالا تو جناح ہال مکمل طور پر بھر چکا تھا نیز درمیان میں خالی جگہ بھی پوری طرح بھر چکی تھی۔ اس کے علاوہ ساتھ والی گیلری میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اس کے باوجود ہمارے بہت سے کرم فرماؤں نے یہ تین گھنٹے کا بھاری بھرکم پروگرام کھڑے ہو کر سنا جو ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ جناح ہال کے سامنے والے برآمدے میں بھی ایک بڑی سکرین پر شارٹ سرکٹ کے ذریعے یہ پروگرام دکھایا گیا جس سے معتدبہ تعداد نے استفادہ کیا۔

جہاں تک حاضری کا تعلق ہے تو وہ جس قدر حوصلہ افزا تھی' اس کے مقابلے میں ساؤنڈ سسٹم انتہائی ناقص تھا۔ پورے پروگرام میں سامعین کو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑا' خصوصاً جنرل انصاری صاحب کی تقریر کے دوران تو ساؤنڈ سسٹم بہت خراب رہا۔ بہرحال ہم منتظمین کی توجہ اس خامی کی طرف مبذول کرانے میں حق بجانب ہیں۔

سقوط ڈھاکہ کے اس جلسے کو اگلے روز کے تقریباً تمام اخبارات نے تصویری جھلکیوں کے ساتھ کوریج دی --- اس پروگرام کو کوریج دینے کے لئے صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی پریس گیلری میں موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اصحاب حل و عقد کو عقل کے ناخن لینے کی توفیق عطا فرمائے اور ملک کو درپیش مسائل سے انتہائی سیاسی بلوغت اور دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نبٹنے کی توفیق فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کو نظام خلافت کا گہوارہ بنائے۔ آمین۔ OO

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

معروف سیاستداں' دانشور اور مصور جناب محمد حنیف رامے صاحب سے ایک سوال اور ان کا جواب

س : کیا آپ چار صوبوں کی بجائے ہر ڈویژن کو صوبہ بنانے کے حق میں ہیں؟

ج : میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو اسے مکمل کیا جائے اور اگر وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا تو پھر سوچ سمجھ کر کوئی نئی تجویز پیش کی جائے۔ پارلیمانی نظام کی اصلاح کر لی جائے۔ اس وقت بہت سے ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے حضرات پیسے کے زور پر منتخب ہو جایا کرے گا۔ پھر سیاسی منصب سے بڑے بڑے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ اگر اس نظام سے ہم تنگ ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کر سکتے تو صدارتی نظام اپنانا چاہئے۔ صدارتی نظام کے بارے میں لوگوں کو شبہات ہیں کہ پنجاب بہت بڑا صوبہ ہے۔ اگر صوبوں کی یہی کیفیت رہی تو پھر ہر مرتبہ شاید صدر یہیں سے منتخب ہو جایا کرتے۔ پاکستان میں تیرہ کروڑ کی آبادی ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک ہیں جن کی آبادی ایک کروڑ بھی نہیں تو پھر اس طرح پاکستان کو کروڑ کروڑ کی آبادی کے حساب سے تیرہ چودہ صوبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ چھوٹے صوبوں پر پنجاب کا خوف بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بجائے کہ لوگ لڑ کر اور احتجاج کر کے' بغاوت کر کے اپنے لئے الگ صوبے بنوائیں خود ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پورے ملک کو چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آپ کو حیرانی ہو گی کہ بلغاریہ' چیکوسلواکیہ جیسے ملکوں میں ایک کروڑ آبادی بھی نہیں ہے۔ ہمارے کراچی شہر جتنی بھی آبادی نہیں ہو گی۔ ترکی جیسے ملک میں ۳۰-۲۵ صوبے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے لسانی بنیادوں کی بجائے انتظامی طریقہ سے۔

(فرائیڈے ایڈیشن روزنامہ جسارت' کراچی)

مکتوب کراچی

یہاں امن ریلی کے روز بھی لاشیں گر رہی تھیں

محمد سمیع

مہاجروں کے لئے الگ صوبہ ؟

انحراف تو پورے پاکستان نے کیا ہے' سزا صرف کراچی کو کیوں !

کیا ہوا اگر کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سیاسی محاذ آرائی چھوڑ دیں۔ یہ تو آج کی سیاست کا اسٹائل ہے۔ اگر ہم نے سیاسی محاذ آرائی ترک کر دی تو حزب اقتدار کے اقتدار کو طول مل جائے گا اور وہ قوم کو اس سے زیادہ لوٹے گی جتنا ہم نے اپنے دور میں لوٹا ہے۔ حزب اختلاف ہم پر حاوی ہو جائے گی اور ہمارے اقتدار کا سورج غروب ہو جائے گا۔ اگر ہمارے اقتدار کا سورج غروب ہی ہونا ہے تو اقتدار حزب اختلاف کو کیوں جائے فوج کو کیوں نہ جائے' مارشل لاء کیوں نہ آئے۔ ویسے بھی یہ قوم مارشل لاء ہی کی مستحق ہے کہ اسے ہماری حکومت گوارا نہیں۔ کراچی میں اگر لاشیں گر رہی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم "لوٹا" بننا چھوڑ دیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو دوسرے "لوٹے" بنیں گے۔ جب کسی نہ کسی نے لوٹا بننا ہی ہے تو ہم کیوں نہ بنیں۔ پھر ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ قوم ہمیں تو لوٹا کہتی ہے لیکن بڑے بڑے "مولانا" اور "نواب زادے" لوٹے بنے ہوئے ہیں۔ قوم انہیں اس خطاب سے کیوں نہیں نوازتی۔

کیا ہوا اگر کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ ہم اوروں کے طور طریقے نہ اپنائیں۔ اوروں نے اپنے قائد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور ان کی شان میں موسیقی سے بھرپور قصیدے گائے۔ اگر ان کے پورٹریٹ قدم آدم سائز کے لگائے گئے' اگر انہوں نے نوجوانوں سے یہ کام لئے تو ہم کیوں نہ لیں۔ وہ تو صرف حقوق کی بات کرتے ہیں ہم تو حقوق چھیننے والوں کی بات کرتے ہیں۔ ان ظالموں سے مظلوموں کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح تو ہم حقوق کی بات کرنے والوں کا سحر توڑ سکتے ہیں۔

کیا ہوا اگر کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں اور یقیناً اس میں مذہبی فرقہ واریت کا بھی حصہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم مدرسوں اور دارالعلوموں سے باہر نکل کر حالات سدھارنے میں لگ جائیں۔ آخر ہمارا اپنا کام ہے' ہم نے اگر یہ کام شروع کر دیا تو ہمارے طلباء کا کیا بنے گا۔ ہمارا حلقہ اثر کیسے قائم رہے گا۔ کیا ہوا اگر کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بند ہو گیا تو ہمارے اخبارات کا کیا بنے گا۔ اگر ہم نے سنسنی خیز خبریں شائع نہ کیں' اگر ہم نے ان میں نمک مرچ نہ لگایا تو کون ہمارے اخبار خریدے گا۔ رہ گئی قومی ذمہ داری والی بات تو یہ ذمہ داری اوروں پر بھی تو عائد ہوتی ہے۔ وہ اسے پورا کریں۔ ہمارے کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا ہوا کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بند ہو گیا تو لوگ رپورٹیں درج کرنے کیسے آئیں گے اور ہماری آمدنی کے دروازے کیسے کھلیں گے۔ کیا ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ اصل مجرموں کو پکڑ کر اپنی روزی پر لات ماریں۔

کیا ہوا ڈکیتیاں بڑھ گئی ہیں۔ اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ ہم سودی کاروبار ترک کر دیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہماری تجوریاں کیسے بھریں گی۔ ہم تو قلاش ہو جائیں گے اور اگر ہم قلاش ہو گئے تو ڈکیتیاں کیسے ہوں گی۔ کیا ہوا اگر کارلفٹنگ زوروں پر ہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم ہر سال گاڑیوں کا ماڈل بدلنا چھوڑ دیں۔ آخر ہمیں نام و نمود کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو استعمال کرنا ہی ہے۔ کیا ہوا اگر لاشیں گر رہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ویڈیو فلموں کا کاروبار بند کر دیں۔ اگر فحش فلموں کو دیکھ کر لوگ جنسی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ ہم اس کے ذمہ دار کیسے ہو سکتے ہیں۔ تشدد کی فلمیں دیکھ کر لوگ اگر قتل و غارت پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو ان کی کم ظرفی ہے۔ ہم اپنا کاروبار بند کر کے کیا فاقوں کا سامان کریں۔

کیا ہوا اگر کراچی میں لاشیں گر رہی ہیں۔ اگر ہم بسوں میں' ہوٹلوں میں' بازاروں میں پورے زور شور سے ریکارڈنگ کا سلسلہ بند کر دیں تو پھر لوگ غم غلط کرنے کے لئے کہاں جائیں گے۔ یہ تو ایک بڑی خدمت ہے جو ہم لوگوں کو مہیا کر رہے ہیں۔

لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ ہم اہل قلم حالات کو سدھارنے کے لئے کچھ کیوں نہیں کرتے۔ لیکن ہم کیا کریں؟۔ ہمارے لئے موضوعات کی کوئی کمی تو نہیں ہے۔ لوگوں نے ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔ ہمیں تو اپنے زندہ رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی سبیل چاہئے۔ اگر ہم اسی موضوع پر لکھتے رہے تو اندیشہ ہے کہ لوگ ہمیں پڑھنا چھوڑ دیں گے۔

دیکھیں نا ہم تو تحریکی لوگ ہیں۔ ہمیں تحریکی سرگرمیوں سے فرصت ملے تو ہم اس بارے میں کچھ غور کریں۔ پھر جو لوگ اپنے سامنے ایسا عظیم ہدف رکھتے ہوں وہ ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں پڑ کر اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ لوگ مرنا چھوڑیں اس ملک کا نظام تبدیل کرنے میں ہمارا ساتھ دیں' لاشیں گرنی خود بخود گرنی بند ہو جائیں گی۔ ہم بے چارے عوام سوائے تماشا دیکھنے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آج کسی اور کی لاش گری ہے کل تمہاری بھی گر سکتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ایسا عین ممکن ہے لیکن اگر کل ہماری لاش گرنی ہے تو ہم آج سے بسورنا کیوں شروع کر دیں۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے' جو بھی لمحات ہمیں اس پر آشوب دور میں میسر ہیں اسے مردہ دلی کے ساتھ کیوں گزاریں۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومت ہمیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتی' پولیس ہماری

محمد صلاح الدین کا قصور کیا تھا؟

کراچی سے تنظیم اسلامی کے بزرگ ترین رفیق، جمیل الرحمٰن بھولا والے کامدیر کے نام خط

مکرم و محترم جناب بھائی اقتدار احمد صاحب دامت فیوضکم وبرکاتکم 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"ندائے خلافت کا تازہ شمارہ (۱۳/ ۱۲/ ۹۴ء) آج کاشف نظر ہوا۔ جس میں محترم محمد صلاح الدین شہید مدیر ہفت روزہ تکبیر کی مظلومانہ موت پر آپ کا تعزیتی شذرہ بھی شامل تھا--- جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ سانحہ فاجعہ کی اطلاع آپ کو ایسے وقت ملی جب کہ پرچہ پریس جا رہا تھا لہٰذا یہی وجہ ہے کہ اس شذرہ میں سانحہ کی تشویش ناکی کے اظہار تک بات محدود رہ گئی۔ اس کی المناکی اور پر خطر پہلوؤں پر کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا--- پاکستان اور خاص طور پر کراچی میں جس بہیمانہ انداز میں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ درحقیقت شدید ترین عذاب الٰہی کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ اس قتل و غارت گری کا اصل مقصد خوف و ہراس پھیلانا اور فرقہ واریت کی باد سموم کو ہوا دینا ہے۔ نیز امن و امان کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ جب کہ محمد صلاح الدین مرحوم و مغفور کا قتل ایک سوچے سمجھے منصوبے کا صاف صاف نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ ایسی ہر زبان کو ہمیشہ کے لئے خاموش اور ہر ایسے قلم کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا جائے جو اسلام اور نظریہ پاکستان سے مخلصانہ عملی و فکری تعلق رکھتا ہو۔ محمد صلاح الدین کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ وہ نظریہ پاکستان کی حفاظت کی سعی و جہد کرنے والوں میں شامل تھے---ان کے بعض تجزیوں اور بعض آراء میں انتہا پسندی بھی ہو سکتی ہے اور ان سے ہر دانشور مخلصانہ طور پر اختلاف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن ان کی جان لینے کا اصل سبب محض یہ انتہا پسندی نہیں بلکہ ان کی اسلام دوستی اور نظریہ پاکستان سے وفاداری کے سوا اور کچھ معلوم نہیں دیتا۔

محمد صلاح الدین مرحوم نے جس مظلومانہ طور پر وفات پائی ہے وہ ان شاء اللہ ان کے لئے توشہ آخرت بنے گی اور بربنائے بشری اگر ان کی طرف سے چند تسامح اور کچھ عدم اعتدال کا ظہور ہوا بھی ہو تو بھی اللہ نے چاہا تو ان کے لئے یہ مظلومانہ شہادت ان سب کے لئے کفارہ بنے گی--- ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند سے بلند ترین فرمائے اور ان کو مقام علیین عطا فرمائے---

بلاشبہ شہید محمد صلاح الدین حکومت وقت کے شدید ترین ناقدین میں شامل رہے ہیں اور موجودہ حکومت کی سب سے بڑی پارٹی یعنی پیپلز پارٹی کو انہوں نے ہمیشہ اسلام دشمن اور ملک کی غدار پارٹی سمجھا ہے اور عوام و خواص کو دلائل کے ساتھ یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے لہٰذا آپ کی یہ بات بڑی صائب معلوم ہوئی کہ "ان کے قاتلوں کی تلاش میں لوگوں کی نگاہیں خود حکومت میں شامل لوگوں کی طرف اٹھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں"--- بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ اگر لوگوں کی نگاہیں اس طرف نہ اٹھیں تو یہ "حیرت انگیز تعجب" کی بات ہوگی--- حیرت ہے کہ کراچی کے امن و امان کی غارت گری، بے گناہ نمازیوں کے قتل عام اور محمد صلاح الدین کی منصوبہ بندی کے ساتھ مظلومانہ موت کے بعد بھی "سندھ" کی موجودہ حکومت پوری آن بان سے قائم ہے اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے روزانہ "سب اچھا ہے" کا راگ الاپا جا رہا ہے اور اس پر پریس بھی صرف نظر کر رہا ہے اور عوام و خواص بھی چپ سادھے نظر آتے ہیں اور موجودہ حکومت سے رستگاری کے لئے کوئی پر امن لیکن نہایت موثر مہم کے آغاز کے دور دور آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ از روئے اسلام ایک قتل ناحق پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔

سوگوار جمیل الرحمٰن

موت کو بھی مشکل بنا سکتی ہے' فوج ہماری ہمدرد نہیں تو ہم یہ کیسے یقین کر لیں کہ حالات سدھر سکتے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو کیوں نہ حالات سے سمجھوتہ کر لیں۔ البتہ مردہ دلی نہ اپنائیں کیونکہ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

مہاجر قومی موومنٹ کی جانب سے سندھ میں مہاجروں کے لئے الگ صوبے کے بارے میں مہاجر عوام سے رائے کا طلب کیا جانا دراصل ان کا اس مسئلہ پر ریفرنڈم کا مطالبہ ہے اور ریفرنڈم یوں ہی نہیں کروایا جاتا بلکہ جس مسئلہ کے حق میں ریفرنڈم کروایا جاتا ہے' اس کے حل کی جانب پیش قدمی مقصود ہوتی ہے لیکن یہ بات جس موقع پر سامنے آئی ہے' وہ سب پر عیاں ہے۔ ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ کا فوجی آپریشن جس کا ہدف اولاً تو امن و امان کی صورت حال کو سنبھالنا تھا خواہ وہ سیاسی سطح پر ہو یا جرائم کے فروغ کی صورت میں' لیکن پھر اس کا رخ مہاجر قومی موومنٹ کی طرف موڑ دیا جانا اور اس کے نتیجہ میں تقریباً پوری مہاجر برادری کے مصائب میں اضافہ وہ عوامل ہیں جن کے پس منظر میں مہاجر قومی موومنٹ کو اس مسئلہ کے حق میں ریفرنڈم کے ذریعے مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے۔

یہ بات جونہی منظر عام پر آئی' نہ صرف ایم۔ کیو۔ ایم بلکہ وہ دیگر تنظیمیں بھی جو کسی نہ کسی سطح پر مہاجروں سے تعلق رکھتی ہیں' یہ تاثر دے رہے ہیں کہ مہاجر صوبہ ناگزیر ہے۔ ایسے میں یہ بات بالکل غیر مؤثر ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم نے مہاجر صوبہ کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس بارے میں عوام سے صرف رائے طلب کی ہے۔ واقفان حال مہاجر صوبہ کے مطالبہ کو نہ ملکی سالمیت کے خلاف سمجھتے ہیں اور نہ اسے کسی کی غداری تصور کرتے ہیں بلکہ فری پورٹ یا ہانگ کانگ اور اس قسم کی باتوں کے تناظر میں اسے غنیمت سمجھا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں موجودہ صوبوں کی مزید تقسیم کو نہ صرف سیاسی جماعتیں مفید تصور کرتی ہیں بلکہ اس سلسلہ میں اب تو گاہے بگاہے قومی رہنماؤں کے بیانات بھی اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں جن میں نواب زادہ نصر اللہ خان جیسے معروف لیڈر سے لے کر حنیف رامے' مولانا عبدالستار خان نیازی اور نواب زادہ شیر علی خان جیسے رہنما شامل ہیں۔ حیرت اس پر ہے کہ اگر ملکی سطح پر صوبوں کی مزید تقسیم ہو تو سب سے زیادہ نقصان بظاہر پنجاب کو پہنچے گا جس کی سیاسی بالادستی جمہوری اصولوں کے تحت ناگزیر لیکن عملاً دوسرے صوبوں کو ناگوار ہے' لیکن پنجاب کے رہنما الا ماشاء اللہ اس کے خلاف نہیں جبکہ سندھ کے قوم پرست رہنماؤں نے اس کے خلاف اتنا واویلا مچا رکھا ہے جیسے صوبہ سندھ کو مقدس گائے جیسی حیثیت حاصل ہو۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سندھ کی تقسیم سے بچنے ہی کی خاطر سہی' مہاجروں کے احساس محرومی کو دور کیا جاتا۔ خوش قسمتی سے اس وقت پیپلز پارٹی یہ کام کرنے کی پوزیشن میں ہے کہ نہ صرف وفاقی حکومت اس کے ہاتھ میں ہے بلکہ صوبہ سندھ کی حکومت پر بھی یہی براجمان ہے۔ اس سے اچھا موقع بھلا کب حاصل ہو سکتا تھا۔ سندھ کی شہری اور دیہی آبادی کے درمیان جو ایک خلیج حائل ہے' یہ اس کو پاٹ سکتی تھی کیونکہ سندھ میں پی پی پی دیہی آبادی کے ووٹوں سے برسر اقتدار آئی ہے۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ حکومت میں آنے کے بعد شہری آبادی کو درپیش صورتحال میں بہتری لانے کی بجائے اس نے نہ صرف Status Que کو برقرار رکھا بلکہ کراچی میں آج صورتحال جس قدر دگرگوں ہے اتنی قیام پاکستان کے بعد کبھی نہیں رہی۔ ایسے میں اگر ایم۔ کیو۔ ایم نے کراچی صوبہ کی بات کی ہے تو اس کی ذمہ داری پیپلز

میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو!

نجیب صدیقی

جس دن کراچی میں امن ریلی نکالی جا رہی تھی اسی دن ۶ افراد گولی کا نشانہ بنے۔ امن ریلی کے لئے جو راستہ متعین کیا گیا تھا اسے عین وقت پر تبدیل کر دیا گیا۔ یہ تبدیلی اس خطرے کے پیش نظر کی گئی کہ اس راستے سے تصادم کی بو محسوس ہو رہی ہے' اس لئے اس راستے کو مختصر کر کے ریلی کو منزل مقصود تک پہنچایا گیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو انتظامیہ ایک ریلی کی حفاظت کا بندوبست نہیں کر سکتی اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ یہ ریلی ایک طرف امن کی خواہش کا اظہار تھی تو دوسری طرف حکومت کے منہ پر طمانچہ بھی! جب یہ ریلی وزیر اعلیٰ ہاؤس پہنچی تو اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ اسی وقت ۶ جنازے قبرستان پہنچائے جا رہے تھے جن کے مرنے والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں کیوں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان میں ایک ایسا بچہ بھی تھا جو گھر سے بازار ناشتہ لینے گیا تھا۔ وہ ناشتہ کیا لاتا اپنی زندگی بھی واپس نہ لا سکا۔ جس شہر میں ڈھائی سال فوج کی کوششوں سے امن قائم نہیں ہوا تو کیا ان ریلیوں سے امن قائم ہو جائے گا۔

امن قائم کرنے کے لئے ہمت و ارادہ کے ساتھ ان اسباب کو دور کرنا ہو گا جن سے معاشرہ ابتری کا شکار ہے۔ امن کی منزل کی طرف انتظامیہ ایک قدم چلتی نہیں ہے اور نہ چلنے دیتی ہے تو منزل کیسے سر ہو گی۔ جمہوریت کے نام پر بدترین آمریت کا نفاذ امن کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ لوگ کھل کر کہتے ہیں کہ اس قتل و غارت گری کا واحد سبب انتظامیہ نااہلی کے ساتھ اس کی جانب داری ہے۔ انتظامیہ چاہتی ہی نہیں ہے کہ اس شہر میں امن و سکون قائم ہو' جس شہر کے ہر محلے میں ڈکیتیاں ہو رہی ہوں' گولیوں کی آوازیں سنی جا رہی ہوں' اسے چین کب نصیب ہو سکتا ہے۔ امن ریلی پر پھول نچھاور کرنے والے اہل کراچی کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ جسم میں کانٹا چبھا ہوا ہے' کانٹا نکالتے نہیں اور اس زخم پر "بے دلی" کا مرہم رکھ رہے ہیں۔ بے سکونی اور ویرانی کراچی کا مقدر بن گئی ہے۔ یہ اس بات کی سزا ہے کہ اس شہر نے پیپلز پارٹی کو ووٹ نہیں دیئے تھے۔ اس سزا کا دورانیہ کتنا ہو گا یہ تو وقت ہی بتائے گا البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اقتدار کے جتنے دن بھی باقی ہیں اہل کراچی کے لئے ابتلا کے بھی اتنے ہی دن رہ گئے ہیں۔ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو معاملات کی سنگینی کا علم نہیں ہے یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنے والے اپنے مقدور بھر حالات کی عکاسی کر رہے ہیں اور آنے والے خطرات سے بار بار آگاہ کر رہے ہیں۔ مگر "نیرو" کی بیسنری کی آواز کبھی "برطانیہ" سے سنائی دیتی ہے کبھی اس کی آواز "چین" سے آ رہی ہے۔ بعض کالم نگاروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس جو کراچی میں بلانے کی تجویز ہے اس اجلاس کو سمندر میں کسی بڑے جہاز پر منعقد کیا جائے اور اس جہاز کو وہیں ڈبو دیا جائے' اس طرح عوام کو مستقل عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔ بعض دل جلے "سقوط کراچی" کے عنوان سے بھیانک تصویر کشی کر رہے ہیں۔

یہاں کے لوگوں سے جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا اس مقصد سے انحراف کے نتیجے میں یہ سزا مل رہی ہے تو ان کا یہ جواب ہوتا ہے کہ یہ انحراف تو پورے پاکستان نے کیا ہے صرف کراچی نے نہیں۔ پھر عذاب صرف ان کے حصے میں کیوں آیا ہے؟ اسلام آباد کے ایوان چراغوں سے منور ہیں اور یہاں ہر گھر کا چراغ بجھانے کا عمل جاری ہے۔ حقائق کی تلخی نوک قلم تک آتی ہے۔ جن لوگوں کی آنکھیں ساون میں بند ہوئی ہوں انہیں تو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی یا جن آنکھوں پر "ڈالر" یا "پلاٹ" کی پٹی بندھی ہوئی ہے انہیں تو ہر طرف خیر ہی خیر نظر آئے گا۔ جن کے نونہال خون میں نہا کر قبرستان کے ویرانوں میں جا چکے ہیں کوئی ان سے پوچھے۔ ان کے زخموں پر کوئی مرہم رکھنے والا بھی نہیں اب سوال یہ ہے کہ حالات درست کیسے ہوں؟ حالات درست کرنے کی کنجی جس کے پاس ہے وہ خود اقتدار کے نشے میں بدمست ہے۔ وہ اپنے "جیالوں" کو بام ثریا تک لے جانے اور اختلاف کرنے والوں کو زمین میں دھنسانے کے عمل میں لگا ہوا ہے۔ اس بدمست ہاتھی کا جب تک نشہ نہیں اترے گا حالات کسی صحیح رخ پر نہیں جا سکتے۔ کون نہیں جانتا کہ فساد عدم توازن سے ہوتا ہے۔ دوہرا معیار نفرتوں کو جنم دیتا ہے۔ عزت نفس سے کھیلنے والے دلوں کو فتح نہیں کر سکتے۔ محض وعظ' تلقین اور بیانات سے حالات کے رخ کو پھیرا نہیں جا سکتا۔ حکمرانی کا "بخار" جب تک نہیں اترے صحیح سمت میں کوئی فیصلے نہیں ہو سکتے۔ جبر کی رات طویل ضرور نظر آتی ہے مگر صبح طلوع ہو کر رہتی ہے۔ فطرت کے اس نظام کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وقت گزارنے کے بعد بڑے بڑے پیکج کوڑے کے ڈھیر جیسے نظر آئیں گے۔ جس نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا اندھیرا اس کا مقدر ہے۔ حمایت علی شاعر کا یہ شعر پاکستان کے ہر دور کی عکاسی کرتا ہے ۔

رہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو' میر کارواں یارو!

پارٹی پر ہی عائد ہوتی ہے کہ اس نے ایم۔ کیو۔ ایم کو حالات سے فائدہ اٹھانے کا ایک اور موقع دیا ہے۔

پیپلز پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں Govt At Your Door Step کو قائم کرنے کے لئے ضلعوں میں گورنروں کی تقرری کی بات کی تھی۔ لیکن جب وہ مہاجروں کے لئے الگ صوبے کی بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو ضلعی گورنر کے تقرر کے معاملہ میں وہ کتنی مخلص ہے' اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اقدام خلوص نیت کے ساتھ نہ کیا جائے تو اس سے مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ ملیر ضلع کا قیام ابھی کل ہی کی بات ہے اب ایک نیا شوشہ چھوڑا گیا ہے کہ کراچی میں تین اضلاع کا اضافہ کر کے جو شہر کے گوٹھوں پر مشتمل تجویز کئے گئے ہیں' کراچی کی بلدیہ کو میٹرو پولیٹن کارپوریشن کا درجہ دے دیا جائے اور اختیارات عوام کے نمائندوں کے سپرد کر دیئے جائیں۔ جناب عبدالستار افغانی کے دور کے میٹرو پولیٹن کارپوریشن کے نمائندوں کا حشر زیادہ دیر کی بات نہیں اور کراچی میونسپل کارپوریشن کے نمائندوں پر الزامات ثابت کئے بغیر ان کو بیک بینی و دوگوش نکال دیا جانا' کارپوریشن پر ایڈمنسٹریٹر کا تقرر اور پھر بلدیہ کے معاملات کا پیپلز پارٹی کے غیر نمائندہ کونسلرز کے حوالے کیا جانا کل ہی کی بات ہے۔ یہ تو اس زمانے کی کارپوریشن کی بات ہے جس میں ملیر ضلع

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

آنے والی تباہی سے بچنے کی یہی ایک شکل رہ گئی ہے

صورتِ احوال یہ ہے کہ...

نعیم صدیقی : صدر تحریک اسلامی پاکستان

"تحریکِ اسلامی پاکستان" کی جانب سے مرض اور علاج کی نشاندہی

"تحریکِ اسلامی پاکستان" کے صدر جناب نعیم صدیقی کی یہ تحریر جو اس نئی جماعت کے تاسیسی اجتماع منعقدہ بین میں ایک قرارداد کے طور پر بھی منظور ہوئی' ہمارے بعض قارئین کی نظر سے بھی گزر چکی ہو گی کیونکہ ایک ہفت روزے کے علاوہ ایک قومی روزنامے میں بھی شائع ہوئی ہے۔ بایں ہمہ ہم اسے اپنے ریکارڈ کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تو اس لئے کہ صدر تحریکِ اسلامی کی تشخیص و تجویز بھی اب وہی ہے جو امیر تنظیم اسلامی' جناب ڈاکٹر اسرار احمد ایک زمانے سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پوری صراحت سے بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مضمون وہی ایک ہے' جناب نعیم صدیقی نے اسے نسبتاً خوبصورت الفاظ کا لباس ضرور پہنا دیا ہے کیونکہ زبان و بیان پر قدرت وہ بہرحال رکھتے ہیں بلکہ چاہتے تو اسی مفہوم کو مترنم اشعار کے سانچے میں ڈھال کر ایک یادگار نظم کی صورت بھی دے ڈالتے۔ تاہم اس تحریر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے قارئین اس واقعاتی حقیقت کو نظرانداز نہ کر سکیں گے کہ ڈاکٹر اسرار احمد یہی باتیں اسلوب بدل بدل کر گزشتہ چوتھائی صدی سے کہہ رہے جبکہ جناب نعیم صدیقی تھوڑے ہی دنوں پہلے تک یک سوئی کے ساتھ اس جماعت کا ساتھ دے رہے تھے جس کی پوری حکمت عملی کا صغریٰ کبریٰ بالکل مختلف تھا اور اب بھی ہے۔ انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر رہ جانے والی جماعتِ اسلامی کے تازہ نعروں اور موجودہ مہماتی سرگرمیوں سے تو نعیم صدیقی صاحب نے پچھلے دنوں اظہار بیزاری کیا لیکن ذرا پہلے تک ان نعروں اور مہم بازی کے نسبتاً شریفانہ انداز کا خود انہوں نے دل و جان سے دفاع کیا تھا جبکہ ان دونوں ہی کی کوئی مناسبت و مطابقت اس لائحہ عمل سے نہیں بنتی جو ان کی تازہ تحریر کے آخری پیرے میں وارد ہوا ہے۔

اس کے برعکس تنظیم اسلامی کی تاسیس کے اول روز ہی سے ڈاکٹر اسرار احمد نے "تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد" کو اپنی دعوت کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جس کی جناب نعیم صدیقی نے اپنی تجویز میں شرح کی ہے تو اجتماعیت کی ان دونوں شکلوں کے مابین باہمی تعاون و اشتراک و اشتراک عمل میں اب کیا چیز مانع رہ گئی ہے؟۔ نعیم صدیقی صاحب جب جماعت اسلامی کے اکابرین میں شامل تھے تب بھی ڈاکٹر صاحب نے متعدد بار انہیں اپنے اجتماعات سے خطاب کی دعوت دینے کے علاوہ ذاتی طور پر تبادلہ خیال کی غرض سے کئی دفعہ خود چل کر ان کے پاس جانے کی اجازت طلب کی لیکن ظاہر ہے کہ ان مواقع پر گریز میں جماعتی مصلحتیں آڑے آئی ہوں گی جن سے اب وہ آزاد ہو چکے ہیں اور ان کی نئی جماعت کے سرکاری موقف کے سامنے آنے کے بعد تو صورت حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔ پچھلے دنوں تنظیم اسلامی کے انیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر ان زعماء کو خصوصی نشستوں میں دعوت خطاب دی گئی تھی جو پاکستان میں غلبہ دین کے لئے انتخابی سیاست کو غیر مؤثر اور انقلابی جدوجہد کو لازم قرار دیتے ہیں۔ ان سے درخواست کی گئی تھی کہ اپنی انقلابی جدوجہد کے طریق کار کی وضاحت فرمائیں تاکہ اس کی روشنی میں خود تنظیم اسلامی کے رفقاء بھی یہ فیصلہ کر سکیں کہ ان کے اپنے طریق کار میں کس اضافے یا کونسی کمی کی ضرورت ہے۔ مدعوئین میں جناب نعیم صدیقی کو بھی شامل کیا گیا تھا تاہم ان کے اور پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کے سوا سبھی حضرات تشریف لائے اور پورے اطمینان کے ساتھ ہمارے پلیٹ فارم سے اپنی بات کہہ گئے ہیں۔ نعیم صدیقی صاحب کے اجتناب کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت تک وہ ایک نئی اجتماعیت کے خدوخال مرتب کر رہے تھے اور طاہر القادری صاحب ملک سے باہر تھے۔

اگلے ماہ تنظیم اسلامی اسی نوع کے ایک اور خصوصی اجتماع کا اہتمام کر رہی ہے جس میں جناب ڈاکٹر طاہر القادری نے شرکت منظور فرمالی ہے جبکہ نعیم صدیقی کی طرف سے تنظیم کی درخواست کا جواب تاحال موصول نہیں ہوا۔ انگریزی محاورے کے مطابق گیند ابھی انہی کی کورٹ میں ہے اور توقع ہے کہ اب کوئی امر ان کے تشریف لانے میں مانع نہ ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو اس کی اصل منزل کی طرف گامزن کرنے کے لئے ہر کوشش یونہی الگ الگ اور ایک دوسری سے بے نیاز رہی تو اپنے خلوص و اخلاص کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اجر کی مستحق تو شاید ہو لیکن اس طوفان کے سامنے ہرگز نہ ٹھہر سکے گی جو ملک کو اس واحد کی وجہ جواز سے محروم کرنے کی غرض سے پوری شدت کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ غالباً آخری موقع ہے کہ وطن عزیز کے اصل بہی خواہ یعنی یہاں دین کا غلبہ دیکھنے کے خواہشمند افراد اور گروہ اگر یک جان نہ ہو سکیں تو کم از کم مل بیٹھ کر اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی ہی کوئی سبیل نکالیں ورنہ نوشتہ دیوار پڑھنے سے انکار کر کے تو دین کے خادم اپنی اور آئندہ نسلوں کی ہی دنیا اور عاقبت خراب کر رہے ہیں

---------- مدیر

وزیر اعظم بے نظیر کی نسائی حکومت کے اس احسانِ عظیم سے ہماری کمر دوہری ہوئی جا رہی ہے کہ وہ امریکی سامراج کی واحد عالمی قوت کے بھاری بھرکم "ڈینوسار" کو گوادر کی بندرگاہ پر لے آئی ہیں۔ اب یہ بندرگاہ سامراجی "ڈینوسار" ہی کے تصرف میں دی جا رہی ہے اور اس کے متصل اسلحہ ڈپو بنایا جا رہا ہے' اس طرح ایک مستقل امریکی اڈے کا کھونٹا... پاکستان کے سینے میں گاڑ دیا گیا ہے۔

ہم پہلے ہی کھٹک رہے تھے کہ کبھی امریکی اثر کے تحت عالمی پیمانے پر کام کرنے والے بینکوں کی طرف سے ہدایات آتی ہیں کہ فلاں فلاں اشیاء پر اتنا اتنا ٹیکس لگاؤ اور فلاں فلاں سروسیز اور اشیاء کی قیمتوں میں اور چارجز میں اتنا اتنا اضافہ کرو۔ اتنا تو خیر ہوتا ہی ہے' لیکن جب ہم نے سفیرہ امریکہ مادام رابن رافیل کو پاکستان پر ایک مقبوضہ نوآبادیاتی ملک کی طرح حکم اور ہدایات دینے اور پسند و ناپسند سے آگاہ کرنے کا کام کرتے دیکھا' اور فدویان ازلی کو رکوع میں سرِ تسلیم خم کرتے پایا تب ہوش آیا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

منصوبہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عرب و افریقی مسلم ممالک کے لئے امریکہ نے ایک قلعہ بندی اسرائیلیوں کو قائم کرائی اسی طرح ایشیا کی قلعہ بندی بھارت کرے جو امریکی سامراج کی گرفت میں ہے۔ اسرائیل کو استحکام دینے کے لئے امریکہ کا خلیجی

فوجی اڈہ قائم ہوا ہے' اسی طرح مسلم دشمن "لاشریک سامراج" افغانستان' ایران اور وسط ایشیا کی نیم آزاد ریاستوں پر اپنا تسلط بذریعہ تجارت (مصنوعات پاکستان میں تیار ہوں گی) بذریعہ ادارات (مدارس و ہسپتال) بذریعہ اجرائے قرض' بذریعہ خدمات ماہرین' بذریعہ ٹھیکوں کے حصول اور بذریعہ ڈپلومیٹک و سی آئی اے کی سرگرمیوں کے قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس مسلم دشمن ڈینوسار کی ایک سکیم یہ ہے کہ کشمیری قوم کو اپنے جوانوں اور بچوں کو بھاری فوج کے ہاتھوں شہید کرا کے اور گھروں' کھیتوں باغوں کو تباہ کرا کے اب جن آخری مشکل لمحوں میں پھنسی ہے' اس کے سامنے امریکہ ہمدرد بن جائے کہ ہم تم کو آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ یہ آزادی اس شکل میں آئے گی کہ مقبوضہ کشمیر اور پاکستانی کشمیر کو ملا کر ایک بڑی ریاست بن جائے گی اور اس میں ایک اور امریکی اڈہ قائم ہو جائے گا' کشمیریوں کو ابتدائی دس سال کے لئے حفاظتی فوج اور اسلحہ مہیا کر دیا جائے گا اور اس کا خرچ یہودی قرض میں بدل جائے گا جس کے جال سے کوئی بچ کے نکل ہی نہیں سکتا۔ پاکستانی بندرگاہ اور اڈے سے بھی اور آزاد کشمیر کے اڈے سے بھی اصل مطلوب چین کی ابھرتی طاقت کی اٹھتی لہروں کو روکنا ہے اور روس پر بھی کڑی نگاہ رکھنی ہے کہ ایک مقررہ حد سے پرے ہی رہے آگے نہ آنے پائے۔ ایک خطرہ جاپان بھی ہے' اس پر بھی کڑی نظر رکھنی ہے۔ اس مہم کے ساتھ ساتھ نہ صرف جدید وسیع تر آزاد کشمیر میں بھارتی عطیات' قرضوں اور بعض تعمیراتی یا صنعتی عنایات کے ذریعے بھارت بھی پاکستان کے عین سر پر بیٹھ جائے اور دیگر مسلم ریاستوں میں بھی اثرات بڑھائے جس کشمیر کے لئے سنگ دل امریکہ کبھی چار آنسو نہ بہا سکا اور ہمدردی کے دو بول نہ بول سکا' اب یہ محافظ حقوق و امن اور یو این او کا چودھری کشمیر کی نئی تقدیر بنائے گا۔

علاوہ بریں بھارت کے تعلقات افغانستان اور ایران میں پہلے ہی فروغ پا رہے ہیں' امریکہ کی امدادی حکمت عملی سے بھارتی خواب کی تعبیر مکمل ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ پاکستان کو بھی اپنا سر غیور بھارت کے آگے نیہو ڑانا ہو گا۔ اس غیر انسانی فاسد پروگرام کا ایک جزو یہ ہے کہ پسنی کی بندرگاہ کو ترقی دی جائے' ادھر کراچی کو سرمائے کے زور سے نیا ہانگ کانگ بنایا جائے۔ اس سکیم میں یہ بات مخفی ہے کہ اگر سندھ کے علاقے کو تقسیم کرنا پڑے تو اس کے پاس ترقی یافتہ بحری راستہ اور بندرگاہ موجود ہو۔ یہ بھارت کے قریب ہونے کی وجہ سے دو طرفہ تجارتی معاملات بھی چلیں گے اور کارخاص کی دخل اندازیاں بھی ہوتی رہیں گی۔ پسنی سے اعلیٰ درجہ کی شاہراہ ایک طرف ایران' افغانستان اور ترکی تک ذریعہ ربط ہو گی اور دوسری طرف وسط ایشیا کی نیم آزاد مسلم ریاستوں تک یہ شاہراہ مار کرے گی۔ اس سلسلے میں جغرافیائی اور سماجی حالات کا جائزہ سیاحوں کی ایک امریکی ٹیم لے گئی ہے اور غالباً پاکستان اور دوسرے علاقوں کو اس مشن کا پتہ بھی نہ ہو گا۔

ادھر عوام کو یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ ہم تم کو منہ مانگی مقدار میں بجلی مہیا کریں گے (۴ تا ۶ روپے فی یونٹ) لہٰذا تم اب کالا باغ ڈیم اور بھاکڑا ڈیم کے چکروں سے نکلو' نیز اب تمہیں ایٹمی قوت کی بھی ضرورت نہیں' اس جھمیلے کو بھی ختم کرو۔ بھارت سے صلح کرانے کے بعد پھر امریکی سامراج یہ کہے گا کہ اب تو تمہیں کسی بڑی فوج کی ضرورت بھی نہیں' لہٰذا پیسہ بچاؤ' اور فوجی بھرتی کے لئے نئے جوانوں کی محدود تعداد چاہئے' لہٰذا فیملی پلاننگ شروع کرو اور کنڈوم کا ہتھیار لے کے قدرتی سکیم اور نبوی" تعلیم کے خلاف توالد و تناسل کو کنٹرول کرو اور حرام کاری خوب پھیلا دو' حتیٰ کہ چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھی یہ سبق پڑھ کر تجربے کریں۔

یہ نقشہ پیش کر کے میں ایک طرف سے ڈوبتے جہاز کا آخری سگنل "ایس او ایس" ہر فرد تک پہنچانا چاہتا ہو۔ یہ حتمی بات بھی کہی ہے کہ پارلیمنٹ میں اس سارے استعماری غدائی کے نوشتہ تزویر کو ایک قطعی قرارداد کے زور سے مٹا کے رکھ دیا جائے۔ یہاں کسی قسم کا اڈا بنانے اور سازش کے جال پھیلانے کی اجازت کسی کو بھی نہیں دی جا سکتی اور نہ کوئی شخص وطن کی زمین یا مکان یا کاروبار کسی غیر پاکستانی قوموں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔ ایسا کرنا غداری ہے۔ کل ایک نظیر کو بنیاد بنا کر بھارت بھی اڈے کے لئے زمین یا صنعت و تجارت میں سرمایہ لگانے کے لئے کاروبار خرید سکتا ہے۔ پھر اسرائیل بھی یہی چاہے گا اور روس بھی مطالبہ کرے گا یہاں تک کہ بیچنے والے سارا پاکستان بیچ کر سوئزرلینڈ چلے جائیں گے اور ہم غلامی کا طوق پہنے تین خنزیر خور قوموں کے نرغے میں آ جائیں گے۔

اب جو کچھ بھی کسی طبقے' گروہ یا جماعت' لیڈر یا عام آدمی سے ہو سکتا ہے وہ مصیبت کی اس کالی رات کو آگے بڑھنے سے روک دے۔ بچہ بچہ یہ فیصلہ کر لے کہ ہمیں نہ غلامی قبول ہے' نہ اڈے قبول ہیں اور نہ سازشیں قبول ہیں۔

آخر میں' میں اپنی پوری قوم کو پوری دردمندی سے اس حقیقت پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب جو کچھ پیش آ رہا ہے' ہمارے اپنے اس بیان سے غداری کرنے کی وجہ سے پیش آ رہا ہے جس کا ملخص یہ تھا کہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

"بگ بینگ" نظریہ کی حقیقت ؟

گذشتہ تین دہائیوں سے کائنات کے بارے میں "بگ بینگ" کا نظریہ قریباً حتمی سمجھا جا رہا تھا' یعنی اس کائنات کا آغاز ایک بہت بڑے دھماکے سے ہوا جس کے نتیجے میں ہر سو پھیلے ہوئے مادے نے جمع ہو کر کہکشاؤں' سیاروں' ستاروں اور چاند کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس سال ستمبر کا آخری ہفتہ اس نظریئے کو تلپٹ کرنے کا موجب بن گیا ہے۔

کائنات کے مشاہدے کے لئے سطح زمین سے تین سو ساٹھ میل کی بلندی پر نصب "ہبل" دوربین کے ذریعے حاصل ہونے والے ان نتائج نے ایک بار ماہرین کائنات کو بھونچکا کر دیا ہے' جو یہ بتا رہے ہیں کہ یہ کائنات صرف آٹھ بلین سال پرانی ہے جو اس لئے ناقابل یقین ہے کہ ستاروں کی عمر چودہ بلین سال سے کم نہیں تو پوری کائنات کی عمر اس سے کم کیسے ہو سکتی ہے۔ تو کیا دوبارہ پرانا نظریہ اپنانا ہو گا کہ کائنات ایک تدریجی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی؟ کیونکہ اس نظریئے کی رو سے خود کائنات سے پہلے دوسرے اجسام کی موجودگی عین ممکن ہے۔ ۷۹ سالہ برطانوی سائنس دان' ہوئیل (Hoyle) زندگی بھر بگ بینگ نظریئے کے مخالف رہے' چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ صرف وقت کا انتظار تھا' اسے اپنی موت مرنا ہی تھا۔

(اسپیکٹ' دسمبر ۹۴ء)

کشمیر کا تنازعہ کیا "ہوائی فائرنگ" سے حل ہو سکتا ہے ؟

یہ مسئلہ فوجی حل مانگتا ہے

میجر (ریٹائرڈ) سعید ٹوانہ

حسنی مبارک جو مصر میں کر رہا ہے' پاکستان میں بھی شروع ہو جائے گا

یہ طویل تحریر ہم روزنامہ "خبریں" لاہور سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مستعار لے رہے ہیں۔ میجر (ر) سعید ٹوانہ کے جملہ خیالات اور نقطۂ نظر کے تمام اجزا سے ہم اتفاق کا اظہار نہیں کرتے لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جو بات اہلِ پاکستان کے دل میں ہے' زبان پر نہیں آتی وہ ٹوانہ صاحب نے بڑے بلند آہنگ کے ساتھ واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے اور اس اعتبار سے ان کی تحریر کی ایک تاریخی اہمیت ہے ---- ادارہ

راقم نے ایک حالیہ مضمون (یہ کیسی جمہوریت ہے؟ روز نامہ خبریں" ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء) میں دعویٰ کیا ہے کہ "اگر چیف آف آرمی سٹاف میری تجاویز پہ غور کے بعد ان پر عمل درآمد کروا سکیں تو ۳۰ دن کے اندر کشمیر لے دوں گا۔"

یہی میرا دعویٰ ہے۔ میرا مقصد یہ بات ریکارڈ پہ لانا ہے کہ "ابھی کچھ نہیں گیا"۔ "ابھی حالات بدلے جا سکتے ہیں" کہ دیر سے حالات مزید ابتر ہوتے جائیں گے۔ قیادت کا دل مجاہد کا دل ہو تو حالات ٹھیک کئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ یہ نہ کہے کہ "کیا پاکستان میں کوئی بھی نہ تھا جو حالات کو بدلنے کی فہم و فراست رکھتا تھا۔"

میری چند تجاویز ہیں۔ چند فیصلے ناگزیر ہو چکے ہیں۔ اس میں یہ فیصلے کرنے ہوں گے جتنی جلد یہ فیصلے کر لیں اتنی جلد ہمارے مسائل حل ہو سکیں گے۔ کشمیر کے بارے میں جو فیصلے ہمیں کرنے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا فیصلہ : کیا فوجی طور پر مسئلہ کشمیر حل کیا جائے یا ڈپلومیسی سے؟

دوسرا فیصلہ : اگر فوجی طور پر یہ مسئلہ حل کرنا ہے تو کیسے کیا جائے؟ اگر ڈپلومیسی سے یہ مسئلہ حل کرنا ہے تو کیسے کیا جائے؟

تیسرا فیصلہ : اس کا ادراک کہ آج' اس وقت' مجموعی صورتحال کس ملک (ہندوستان' پاکستان) کے حق میں ہے۔ کیا صورت حال ہندوستان کے حق میں ہے یا پاکستان کے حق میں؟

چوتھا فیصلہ : اگر فوجی طریقہ سے مسئلہ کشمیر حل کرنا ہے تو اس کی بنیادی سٹرٹیجی کیا ہو گی؟

پانچواں فیصلہ : لازماً جنگ پورے ملک میں پھیل جائے گی۔ پاکستان کو بچانے اور ہندوستان کو عبرتناک فوجی' اخلاقی شکست دینے کے بنیادی طور طریقے کیا ہوں گے؟

چھٹا فیصلہ : کشمیر لیتے ہی باقی علاقوں میں جنگ کو مختصر کرنے کے کیا طریقے ہوں گے؟

ساتواں فیصلہ : کامیاب جنگ کے بعد کشمیر کا کیا مستقبل ہو گا؟ پاکستان سے الحاق یا آزاد کشمیر یا اقوام متحدہ کی (Manddated Territory) ہو گی؟

اب آپ پہلے فیصلے کی طرف آیئے۔ کیا یہ فوجی پرابلم ہے یا ڈپلومیٹک؟

میرا جواب یہ ہے کہ یہ پرابلم اس روز بھی تھا جب راقم پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا' بچہ تھا۔ اس روز بھی تھا جب راقم ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لڑ رہا تھا' اور آج بھی وہی پرابلم ہے جب راقم بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ فلسطینیوں کی طرح کشمیریوں کی بھی دو نسلیں اس "مسئلہ کشمیر" میں کھپ چکی ہیں۔ اس لئے مسئلہ کشمیر فوجی پرابلم ہے اس لئے حل نہیں ہو رہا کہ ہم نے ابھی تک اس فوجی پرابلم کا سامنا نہیں کیا۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک مساجد میں دعائیں تو مانگیں لیکن مسئلہ کی "تھیسس" (کہ یہ فوجی پرابلم ہے) کے مطابق اس کا حل نہیں نکالا۔ مسئلہ کشمیر ایک پتھر کی طرح ہے وہیں پڑا رہے گا جب تک ہم اس پتھر کو اس کی جگہ سے ہٹائیں گے نہیں۔ دعاؤں سے پاگل خانے کے مکین چاند پہ نہیں پہنچ سکتے۔ دعا کی قبولیت کے لئے مسئلہ کا علم و ادراک اور اس کے حل کا عمل درکار ہوتا ہے اور یہاں علم اور عمل کا فقدان ہے اس لئے دعائیں پھل نہیں لا رہیں۔

کشمیر کو ہندوستان نے پہلے غداروں کے ذریعے دبوچے رکھا اب فوج کے ذریعے دبوچا ہوا ہے۔ اب ننگی فوجی طاقت ہے' خونی پنجہ ہے۔ ہم اس خونی پنجہ کو توڑ کر ہی کشمیری بھائیوں کو آزاد کروا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ کام صرف اور صرف فوج کا ہے (ہاں فوج کے ساتھ عوام اور گوریلے "مجاہدین" جائیں گے) یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا گوریلا جنگ (افغانستان سٹائل) سے مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گوریلا جنگ سے مسئلہ کشمیر التوا میں پڑا رہے گا۔ حل نہیں ہو گا۔ دشمن کے پاس فوجی بھرتی کے لئے وسیع علاقہ ہے۔ اس کی لاشیں سارے بھارت میں پھیل جائیں گی اس لئے نظر نہ آئیں گی لیکن ادھر کشمیریوں کی لاشوں سے کشمیری ختم ہو جائیں گے۔ پس گوریلا جنگ ہندوستان کی مدد کر رہی ہے۔ ہندوستان کو کشمیری قوم ختم کرنے کا جواز مل گیا ہے اور وہ دھڑا دھڑ کشمیری ختم کر کے مسئلہ ختم کر دیں گے۔ اس لئے صرف پاکستان کی فوجی مداخلت سے یہ مسئلہ حل ہو گا۔

چھوٹا سا کویت کبھی آزاد ہو سکتا تھا؟۔ ساری دنیا کی فوجیں آئیں۔ انہوں نے "پنجہ کھولا"۔ کشمیری بھی فوجی پنجہ کی گرفت میں ہیں۔ فوجی پنجہ کو صرف فوج کھول سکتی ہے۔ توڑ سکتی ہے۔

اصول یہ ہے کہ جہاں فوج نہ ہو وہاں شہری آبادی ذبح ہو جاتی ہے۔ حریت پسندوں نے کشمیر میں گوریلا جنگ تو شروع کر رکھی ہے لیکن کیا وہ شہری آبادی کو بچا سکتے ہیں؟ کشمیری ذبح ہوتے رہیں تو اس گوریلا جنگ کا کیا فائدہ؟ اور پھر کشمیر میں کتنے نوجوان رہ گئے ہیں؟ ہندوستانی فوج تو کشمیریوں کی نسل مار رہی ہے۔ Genocide کر رہی ہے تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ مسئلہ ختم ہو جائے۔ یہاں ہندو آباد کئے جا سکیں۔ اگر افواج ہند کے اتنے ننگے مقاصد نہ ہوتے تو وہ ضرور بضرور کشمیریوں سے پولیٹکل مفاہمت کے اسباب استوار کرتے۔ کشمیریوں سے "پولیٹیکل مفاہمت" کا ارادہ بھی نہیں۔ یہ ثبوت ہے کہ پوری کشمیری مسلم قوم کے Genocide کا ارادہ ہے اور ہندوستان اس سٹرٹیجی میں بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب ساری دنیا کشمیریوں کی مدد کرنے سے قاصر نظر آتی ہے اور سب کا انداز معذرت خواہانہ رہ گیا ہے۔ گویا عملاً ہندوستان کو Genocide (نسل کشی) کے لئے عالمی اجازت مل گئی ہے۔ اب فوج نہیں صرف بچے لڑ رہے ہیں' ذبح ہو رہے ہیں اور پاکستان آخری کشمیری بچے کے ذبح ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ ہماری Criminal Inaction (مجرمانہ بے عملی) دراصل "قتل

عام کی خاموش اجازت" کے مترادف ہے۔ آج کشمیر میں مسلمان قتل ہو رہے ہیں۔ کل ہمارے ہاں یہ Genocide شروع ہو جائے گا۔ کشمیر میں قتل عام کی یہ رفتار رہی تو اگلے پانچ سال میں کوئی نہ رہ جائے گا۔ پھر یہ مسئلہ ہندوستان کے حق میں ہو جائے گا۔

اب ہمارے قائد اعظم نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ہم مسلمانوں کی حفاظت کریں گے۔ قائد اعظم کے زمانے میں چند شرمن ٹینک افواج پاکستان کے پاس تھے لیکن قائد اعظم نے اعلان جہاد کر دیا تھا۔ اب ہزاروں ٹینک ہیں لیکن ہمارے قائدین چوڑیاں پہن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ذرا ہمارے دفاعی بجٹ پر نظر ڈالیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد آج تک ہم نے ۶۰-۵۰ بلین ڈالر دفاع پر لگا دیا۔ پاکستانی فوج کو قوم نے بجٹ دیا' خود پیٹ کاٹ کر روٹی کھائی۔ اگر ۶۰-۵۰ بلین ڈالر قوم کے لئے روزگار مہیا کرنے پر خرچ کیا ہوتا تو قوم آج کہاں ہوتی؟ ہمارا سوشل اور اکنامک سیکٹر کہاں ہوتا؟ آج محض مسئلہ کشمیر کو التوا میں رکھنے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ سوشل اور اکنامک سیکٹر تباہ حال ہے اور قوم بدحال ہے۔

قوم نے دفاع پر روپیہ اس لئے خرچ کیا تھا کہ اس قوم کے چھوٹے چھوٹے بچے ذبح ہونے سے محفوظ رہیں۔ "فوج ایک جنگلے کی طرح ہوتی ہے جو قوم کے بچوں کو شیر کی کچھار میں گرنے سے بچائے رکھتی ہے۔ جب قوم کے بچے شیر کے کچھار میں گرنے لگیں تو فوج کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جنگلہ کس کام کا جو قوم کو محفوظ نہ کر سکے اور کیا کشمیری مسلمان ہماری قوم کا حصہ نہیں؟

اگر پاکستان نے ترقی کرنی ہے تو اس کی فوجی ذمہ داری نبھا کر ترقی کا دروازہ کھولنا ہو گا۔ فوج جہاد سے گریز کرے تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔ دفاع پر رقم خرچ ہوتی رہے گی اور ہم یہ رقم کھلاتے کھلاتے دیوالیہ ہو جائیں گے پھر دوسری اقوام پیسہ لگا کر ملک پہ قبضہ کر لیں گی۔ (امریکن سینیٹر نے یہ کہا کہ ہم نے "پانامہ" میں پیسہ لگایا ہوا ہے' ہم "پانامہ" کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟)

کشمیر میں ہماری مسلمان قوم ایک خونی پنجہ کی گرفت میں آ چکی ہے اور ہماری فوج ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ جب دودھ پیتے بچے بھی نہ رہیں گے' سارے مارے جائیں گے تو روز محشر ہم اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

اس لئے افواج پاکستان ہی وہ صحیح طاقت ہے جو مسئلہ کشمیر حل کر سکتی ہے۔ جمہوریت کے کہتے ہیں؟ سب قوم کی ایک آواز ہے کہ "کشمیری مسلمانوں کی مدد کرو" یہاں جمہوریت نہیں صرف میر جعفر اور صادق نظر آتے ہیں جو بیرون ممالک سے ہدایات لیتے ہیں۔ اپنی قوم ذبح ہو رہی ہے ان کے بچے پولو کھیلتے ہیں' عیاشی کر رہے ہیں۔ جی ہاں! صرف اور صرف افواج پاکستان مسئلہ کشمیر حل کر سکتی ہیں۔ جتنی جلد ہم یہ معاملہ سمجھ جائیں اتنی جلد مسئلہ حل کی طرف روانہ ہو جائے گا اور راقم تو یہ کہتا ہے کہ "حل صرف ۳۰ دن دور پڑا ہوا ہے"۔

اب سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ اچھی حکمت عملی نہ ہو گی کہ افغان جہاد کی طرح کشمیریوں کی مدد کی جائے' خود جنگ میں ملوث نہ ہوا جائے؟

جواب یہ ہو گا کہ "گوریلا جنگ مسئلہ کشمیر کو طوالت دینے کا دوسرا نام ہے"۔ فیصلہ کن جنگ ہی "مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کا اصل نام ہے"۔ ہمارے سامنے دو حکمت عملیاں ہیں۔ پہلی یہ کہ گوریلا جنگ کے ذریعے کشمیری نوجوانوں کی مدد کر کے ہم ہندوستان کی افواج کو تھکا دیں گے۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کی فوج کو کاٹتے رہیں۔ دوسری حکمت عملی یہ کہ افواج پاکستان کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو حل کیا جائے۔ دونوں میں بہترین حکمت عملی کیا ہو سکتی ہے؟

میرا جواب یہ ہے کہ "دوسری حکمت عملی" ہی بہترین سٹریٹجی ہے۔ دوسری سٹریٹجی ہمارے "ایمان" کا کھلا ثبوت ہو گا۔ ہماری پاکستانیت کا کھلا ثبوت ہو گا۔ اگر پاکستان نے ایمان کی طاقت کا مظاہرہ نہ کیا تو یہ مسلم دنیا کے لئے اخلاقی' دینی' روحانی خوراک کی بجائے "پھوس" بن جائے گا۔ پہلی سٹریٹجی (صرف گوریلا جنگ) "منافقت" ہو گی۔ ہماری یہ خواہش کہ ہندوستانی افواج کشمیر میں تھک جائیں کی بنیاد منافقت پر ہے کیونکہ "بچے مرنے سے تو یہ سٹریٹجی نہیں رک سکتی"۔ افواج ہند بے اعتنائی سے بچے ذبح کرتی جائے گی۔ ہماری منافقت دشمن کو فتح سے ہمکنار کر دے گی کیا یہ منافقت نہیں کہ "ہم بچ جائیں ہمارے ہمسائے مارے جائیں" دو نسلیں تو برباد ہو چکی ہیں ہمیں بڑھ کر کشمیریوں کی تیسری نسل کو برباد ہونے سے بچانا چاہئے۔ ہمیں فی الفور مظلوم مسلمانوں کے کام آنا ہو گا۔ فیصلہ کن معرکوں سے دشمن کو عبرتناک شکست دینی ہو گی۔ ہندوستانی افواج سے ہتھیار رکھوانے ہوں گے۔ انہیں مسلم کشی اور مشرقی پاکستان کے سقوط کی ایسی عبرتناک سزائیں دینی ہوں گی کہ آئندہ صدیوں تک "ہندو قوم" کو مسلمان قوم کے خون بہانے کا خوف پڑ جائے۔

سلطان احمد شاہ ابدالی ہرات کے قریب جنگ لڑ رہے تھے وہاں یہ سنا کہ ان کے صوبہ لاہور میں سکھوں نے ہندوؤں کے اکسانے پر لاہور کے قصائیوں کے ناک اور کان کاٹ دیئے (جنہوں نے گاؤکشی کی تھی) ان کا منہ کالا کر کے گدھوں پر پھرایا۔ سلطان نے اپنی جنگ وہیں ٹھپ دی صرف ۳۰۰۰۰ فوج کے ساتھ آندھی کی طرح لاہور آئے۔ یہاں ۸۰۰۰۰ سکھوں کو جنگ میں شکست دی پھر ان قصائیوں کا منہ کالا کرنے والوں کے سر کاٹ کر ۸۰ "گنڈے" ان قصائیوں کے محلے کے باہر کھڑے کروا دیئے اور یوں اسلام دشمنی کی سزا کی سند لکھ دی۔ سلطان نے ایک دفعہ دس ہزار کا دستہ بھیجا کہ مجھے فلاں ہندو لیڈر کا سر کاٹ کر لاؤ اور اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مسلم افواج کی سپلائی اور رسد بند کر دی تھی دو روز بعد کٹا ہوا سر آ گیا اور سپلائی سسٹم بحال ہو گیا۔

اگر جمہوریت کا معیار ہوتا تو محمد بن قاسم کے چھ ہزار سپاہیوں کی سندھ میں کیا وقعت ہے؟ احمد شاہ ابدالی کے تیس چالیس ہزار فوجیوں کی دو لاکھ مرہٹہ فوج کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ مسلمان قوم کی اصل حیثیت ان کے لڑنے' مرنے' مارنے اور "جہاد" کی تربیت سے ہے۔ اس سے دبدبہ پیدا ہوتا ہے فوج ہوتے ہوئے بھی ہمارا ہندوستان پر کوئی دبدبہ نہیں۔ پھر فوج نہ ہوئی "گلے کا لاکٹ" ہو گیا۔ سنہری خوبصورت منگا لاکٹ!! ہمیں اپنے اسلاف کے قوانین جنگ کے مطابق چلنا ہے۔ پاکستان اگر برصغیر میں اس روز معرض وجود میں آیا تھا جب پہلا مسلمان یہاں وارد ہوا تھا تو پاکستان مسلمانوں کو اکٹھا رکھنے' انہیں غیر مسلموں سے بچانے کا دوسرا نام ہونا چاہئے۔

ہمیں کسی سے سرٹیفکیٹ نہیں لینا بس خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرخرو ہونا ہے۔ اگر ہمارا ہندو' یہودی' عیسائی اقوام پر دبدبہ نہیں تو پاکستان بنانے کا کیا فائدہ تھا؟ جمہوریت کی فضا تو ہمیں تقسیم ہند کے بغیر اکھنڈ بھارت میں نصیب ہو سکتی تھی۔ پاکستان بنائے بغیر ہم جمہوریت سے مستفید ہو سکتے تھے۔ جمہوریت کے سٹیشن تک پہنچنے کے لئے ہمیں مطلقاً پاکستان کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ہم نے ایک بت بنا لیا ہے اس بت کا نام جمہوریت ہے ہم نے اس کی پوجا شروع کر دی ہے۔ وہ ہمارا سرکاری مذہب بن گیا ہے۔

بے نظیر حکومت کی منافقت دیکھو۔ یہ حکومت لندن میں "سندھی کلچر" کو ہوا دے رہی ہے کہ سندھ علیحدہ ملک ہے۔ اس کا کلچر اور ہے' زبان اور موسیقی اور۔ انگریز کو خوش کر دیا۔ وہ راضی ہو چکا ہے کہ اس نئے سندھی کلچر کو جداگانہ وطن بنا دیں۔ جیسے کویت عراق سے چھین لیا تھا۔ اب تھر کے کوئلے پر فرنگیوں کی رالیں ٹپک رہی ہیں۔ وہ نیول بیس بنا لیں گے' پھر افواج پاکستان سندھ سے کٹ جائیں گی' سمٹ کر پنجاب واپس آ جائیں گی۔ کل کلاں اگر کوئی "پاکستانی صدام" سندھ مانگے گا تو یہ "نئے امیر" ساری دنیا کی فوجیں اس صدام کو "کرش" کرنے کے لئے لے آئیں گی اور پھر بھی ہمارے فوجی دانشور خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں جب پاکستان کا بیج مارا جا رہا ہے ان دانشوروں کا Criminal Inaction پاکستان سے غداری کے برابر ہے۔

اگر ہم نے فوج ہوتے ہوئے بدامنی کی اذیت ناک زندگی گزارنی ہے تو پھر اس فوج کا کیا فائدہ؟۔

۱۹۷۱ء جنگ میں راقم کو جال والا سیکٹر بہاولپور بھیجا گیا کہ پاکستان انفنٹری کمپنی اور ٹینک ٹروپ بھاگ گیا ہے' تم ان کو مجتمع کر کے کھویا ہوا علاقہ واپس لو۔

راقم جب محاذ پہ پہنچا تو ٹینک ٹروپ لیڈر "ہیرو" بنا ہوا تھا۔ لمبے لمبے بال' کمانڈو بوٹ' کیموفلاج جیکٹ اور

ہاتھ میں (Harrold Robin) کا کوئی ناول' اس کے ٹینک دشمن کے لئے ایک کانوائے کی صورت میں سڑک پہ کھڑے تھے۔ ٹینک والے اور بھاگی ہوئی انفنٹری کمپنی والے گنے کے کھیتوں میں گھسے گنے چوس رہے تھے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ دوسرا کہاں ہے۔ بھاگے ہوئے فوجی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کو جنگ پر استوار کرنا موت سے کھیلنے کے برابر بات ہے کیونکہ وہ آپ کو پیٹھ میں گولی مار کر اپنی پوزیشن قائم رکھتے ہیں۔ مجھے کچھ ہاتھ نہ آیا تو میں نے ایک موٹا ڈنڈا پکڑا اور سب کو "مرغا" بننے کا حکم دے دیا۔ ایک جے سی او نے کہا "صاحب ہم جے سی او ہیں مرغا نہیں بن سکتے۔" میں نے جواب دیا "تم پہلے یہ ثابت کرو کہ تم ایک سپاہی ہو"۔ "جے سی او تو بعد کی بات ہے"۔ سب مرغا بن گئے ڈنڈا تھا۔ سب ڈر گئے پھر انہیں سیدھا کھڑا کر کے راقم نے کہا۔

"آج تمہارے والدین' دادا' نانی' سب فوت شدہ بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکال دیا ہے۔ ان کی روحیں تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔ وہ دیکھو سامنے ان کی روحیں کھڑی تمہیں "ٹھے منہ" کہہ رہی ہیں۔"

سپاہی رو پڑے' کہنے لگے "اب آپ کمانڈر ہیں ہم خوشی سے جان پہ کھیل جائیں گے۔"

دو دن کے بعد ہمارے پاس سابقہ پوزیشن بحال ہو چکی تھی۔ کھوئے ہوئے علاقے واپس مل گئے۔ ایک انفنٹری کے آفیسر نے اپنے کرنل سے کہا۔

"آج ہم نے نمک حلال کیا ہے"

تو آج راقم کہتا ہے کہ "تم کب اپنا نمک حلال کرو گے؟"

ہمارے قائدین گالف کھیل رہے ہیں اور اپنا غصہ بے چارے تیتروں پر نکال رہے ہیں۔ قوم اذیت میں پھنسی جا رہی ہے' بدامنی ہے' بدحالی ہے' عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ کہیں اہل مغرب نے "جمہوریت" کا بت اس لئے تو نہیں گھڑا کہ مسلم دانشور بیجڑے بن جائیں۔ قوم کا خون بہتا نہ دیکھیں۔ دیکھیں بھی تو ان کے کان پہ جوں تک نہ رینگے۔ تو اٹھاؤ اپنی جمہوریت اور چلے جاؤ ہندوستان' اپنے جمہوری ملک میں۔ یہ پاکستان ہے' یہ فوج اسلامی تھی اس کو اسلامی فوج بنانا ہو گا۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میں پورے پاکستان سے پوچھتا ہوں "اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہو' اپنے رہ گئے ایمان سے کہو" کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟۔ پورے پاکستان کے ضمیر سے یہ میرا سوال ہے۔ چلئے پہلا اور دوسرا فیصلہ ہو گیا کہ مسئلہ فوجی حل مانگتا ہے اور پاک فوج ہی اس کا حل ہے۔

اب تیسرے فیصلے کی طرف آیئے کہ "مجموعی صورت حال کس ملک کے حق میں ہے۔ پاکستان کے یا ہندوستان کے؟"۔

میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ اخلاقی' تاریخی' بین الاقوامی اور فوجی لحاظ سے ہم فتح کے قریب بیٹھے ہیں۔ مجموعی صورت حال آج بھی ہمارے حق میں ہے۔ مندرجہ ذیل عوامل مجموعی صورتحال کو ہمارے حق میں کر دیتے ہیں۔

☆... کشمیر کی فوجی "جیومیٹری" جس میں ہم بیرونی محاذ (Exterior Lines) میں ہوں گے اور ہندوستانی فوج اندرونی محاذ میں (Interrior Lines) ہو گی۔ اگر وہ کلاسیکل انداز میں ہوں (Interior Vs Exterior Lines) تو جنگ شروع ہوتے ہی مقبوضہ کشمیر کے وسیع علاقوں پہ ہمارا قبضہ ہو جائے گا اور اگر ہم افواج ہند کی پسپائی سے قوت مرکوز کرنے کی صلاحیت ختم کر دیں (جو کشمیر کے علاقے میں آسانی سے کیا جا سکتا ہے) تو افواج ہند تتر بتر ہو کر شکست کھا جائیں گی۔

☆... جنگ کے دوران ہندوستانی فوج دو محاذوں پر الجھی ہو گی۔ اندرونی اور بیرونی محاذ۔ اندرونی محاذ وہ کشمیری نوجوان مجاہد ہوں گے جنہیں ہم راتوں رات جیٹ طیاروں سے اسلحہ فراہم کر دیں گے۔ بیرونی محاذ پر پاک افواج کا مکہ (Punch) ہو گا۔ بھارتی فوج کا وہی حشر ہو گا جو مشرقی پاکستان کی جنگ میں پاکستانی افواج کا ہوا تھا۔

☆... کشمیر میں بھارت کی نسبت پاکستان زیادہ بہتر انداز میں اپنی مسلح قوت استعمال کر سکتا ہے۔ فوجی آپریشن سمجھنے والے یہ جانتے ہیں۔

☆... مقبوضہ کشمیر میں گنتی کی چند پہاڑی وادیاں ہیں جن میں دشمن فوج کی حرکت کو آسانی سے روکا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہم بیرونی محاذ سے لڑ رہے ہوں گے۔ دشمن کے لئے یہ کرنا ممکن نہیں۔

☆... ہندوستان کو ہمسایوں اور شمالی علاقوں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ کوئی ہمسایہ (چین' روس' افغانستان) اس کی مدد نہیں کرے گا جبکہ ہمیں تمام ہمسایوں کی مدد مل سکتی ہے۔ افغان مجاہدین تو "علی علی" کرتے میدان میں ہمارے ساتھ کود پڑیں گے۔ ظالموں سے بدلہ لینے کے لئے تمام دنیا کے مسلمان مدد کو پہنچیں گے۔

☆... پاکستانی قوم اور فوج کو ایک نیا ولولہ جہاد سرشار کر دے گا۔ ظالم ہندو فوجی' نہتے لوگوں کا خون بہانے کے بعد' بے جگری سے لڑنے والوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ چیخے گا' چلائے گا افواج پاکستان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر دس لاکھ قبائل اور لاکھوں پاکستانی میدان میں کود پڑیں گے۔ آناً فاناً مقبوضہ کشمیر میں جہاد چھا جائے گا۔ سکھوں سے معاہدہ ہو جائے گا۔ ہماری افواج اور مجاہدین کو کشمیر کا بچہ بچہ خوش آمدید کہے گا۔ اگر ہم دم خم دکھائیں گے تو دنیا والے الٹا بھارت سے معذرت خواہ ہو جائیں گے اور "سوری" کر لیں گے۔

☆... پھر بھارت کو ہم نے ۱۹۷۱ء کا قرض بمعہ سود ادا کرنا ہے وہ کشمیر کی جنگ میں ہی ممکن ہو سکے گا۔

☆... پوری امت محمدیہ میں کفار کے خلاف جہاد سے تازہ روح پھونک دی جائے گی۔

☆... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم داخلی معاملات میں Introvert (دروں بیں) ہو کر منقسم ہو رہے ہیں۔ خارجی معاملات میں Extrovert (وسیع النظر) ہو کر ہم متحد ہو جائیں گے۔ (جیسے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارا تجربہ ہے)۔

☆... اب پاکستانی قوم منتشر ہو رہی ہے' بدحال ہے' مایوس ہے' دل شکستہ ہے۔ دراصل یہ ہماری "جہاد گریزی کی سزا ہے"۔ سزا ختم کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ جہاد شروع ہو۔

اب اس جگہ یہ سوال اٹھے گا کہ "ہندوستان جنگ کا محاذ مغربی' پنجاب' سندھ اور سمندروں میں بھی کھول دے گا"۔ جواب یہ ہے کہ "بالکل کھولے گا" لیکن کشمیر کا علاقہ اگر وہ ہار جائے تو ہماری افواج اس کے عقب میں اور بازوؤں Flanks and Rear میں آ جائیں گی۔ ہم دہلی کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ اگر پتھر بھی پھینکیں گے تو وہ دہلی میں جا پہنچے گا اور جب ہماری یلغار دہلی کی جانب ہو گی تو اس کی ساری سندھ میں بھیجی ہوئی افواج فیصلہ کن معرکوں میں غیر حاضر ہو گی۔ ہم نے بھارتی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ "حاضر دشمن" دوسرا حصہ "غیر حاضر دشمن" ہم "حاضر دشمن" سے نپٹ کر "غیر حاضر دشمن" کے خلاف ڈیپلائنٹ کر سکیں گے۔ اس طرح اسے قسط وار شکست مل جائے گی جس کو انگریزی میں Defeat in Detail کہتے ہیں۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ آخر راقم کس طرح وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ہم "کشمیر جیت جائیں گے؟" فرض کیجئے ہم کشمیر ہار جائیں الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں تو کیا ہو گا؟ سندھ اور پنجاب ہار جائیں تو کیا ہو گا؟ کون ہمیں عقلمند کہے گا۔ اگر ہم کشمیر لیتے لیتے پورا پنجاب اور سندھ کھو دیں؟ ہٹلر کی طرح پورا یورپ فتح کر لینے کے لالچ میں اپنا جرمنی ہار جائیں؟ تو اس جنگ کا پاکستان کو کیا فائدہ حاصل ہو گا؟"

یہ بہت اچھا سوال ہے۔ جب دو فوجیں جنگ کے لئے نکلتی ہیں تو دونوں کو شکست کے وسوے اور فتح کی امید ہوتی ہے۔ جیسے کھیل کے میدان میں جب تک کھیل نہ چکیں ہار جیت کا پتہ نہیں لگتا۔ اس لئے دیکھنا یہ ہو گا کہ کس فوج کے حق میں کیا عوامل Factor ہیں۔

افواج پاکستان کے حق میں کشمیری آبادی ہے' جہاد کا ولولہ ہے' چین اور روس مدد نہ بھی کریں تو "عدم مداخلت" ہو گی۔ ہندوستانی فوج نہتے لوگوں پر ظلم و بربریت اور بچے مارنے کی ٹریننگ کے بعد جب میدان جنگ میں آئے گی تو ایسی بربریت سے اس کے ہاتھ پاؤں سوج چکے ہوں گے۔

جب ہم جہازوں کے ذریعے راتوں رات آناً فاناً انہی

کشمیری شہریوں کو مسلح کر دیں تو وہ شہری خود شیر دل ہو کر بھارتی فوجوں کو سنگینوں پر اٹھالیں گے۔ قومی مقصد ملتے ہی وہ "شیر دلیر" ہو جائیں گے۔ ساری وادی کشمیر میں "نعرۂ تکبیر" گونجے گا۔ قوم کے وہ بچے جو بیروز گاری اور قومی ڈائریکشن کے فقدان کی وجہ سے کلاشنکوف اٹھائے پھرتے ہیں مایوسی میں نشے میں مبتلا ہیں' ڈاکو بن رہے ہیں۔ یقین کر لیجئے کہ ان کی گرج سے ہندو فوج بھاگ کھڑی ہو گی۔ ہندو کو یہ کیسے جرات ہوئی کہ وہ ہماری مساجد کو مٹائے' کہ وہ مسابھائی انداز میں مسلمانوں کی غیرت کو للکارے' مشرقی پاکستان یاد دلائے اور ہمیں بحیرہ ہند میں پھینکنے کا خوف دلائے۔

بھارتی فوج کے حق میں کیا ہے؟ بہت دور بیٹھی اسرائیلی فوج یا امریکن فوج؟۔ تو کیا امریکن افواج کشمیریوں کی آزادی کے خلاف میدان میں اترے گی؟

کشمیر کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کشمیر بھارت کا ہے یا پاکستان کا' تو یہ ابھی تک ایک کالونی ہے' پاکستان یا ہندوستان کی کالونی (Colony)۔ کسی بھی کالونی کی تقدیر کا فیصلہ "چند خطوط" سے یا "فوج کشی" سے نہیں ہو سکتا۔ یہ انٹرنیشنل لاء ہے۔ کالونی کے لوگوں سے آج نہیں تو کل پوچھنا ہو گا۔ یہی امریکن "رابن رافیل" کہہ گئی ہے۔ صرف جنگ کے ذریعے ہندوستان سے وہ منوایا جائے جو امریکہ کہہ رہا ہے' صرف جنگ کے ذریعے ہندوستان سے وہ منوایا جائے جو اقوام متحدہ کی قراردادیں ہیں یعنی "رائے شماری"۔ اس لئے راقم کہتا ہے کہ ۳۰ دن کے اندر اندر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ تاریخی' اخلاقی اور قانونی لحاظ سے ہمارا پلڑہ بھاری ہے تو بس یہ رہ جاتا ہے کہ ہم بہت ہمت سے کام لیں اور۔

"ہمت مرداں مدد خدا"

کے تحت مسئلہ کشمیر کا خاتمہ کر دیں۔ مسئلہ کو طوالت دینے سے خون بہتا رہے گا۔ اختصار مسئلہ سے ایک دفعہ خون بہے گا لیکن ظالم کا' خون صرف ایک دفعہ بہے گا لیکن فیصلہ ہو جائے گا۔

اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کریں کہ فوجی طریقہ کی بنیادی حکمت عملی کیا ہو گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "بنیادی حکمت عملی فیصلہ کن معرکوں سے بھارتی افواج کو گرا لینے کی ہو گی۔" بھارتی فوج کو مقبوضہ کشمیر میں گرانے کی "جیومیٹری" (Geometry) بہت ہی خوبصورت ہے۔

ہماری ایک متحرک صلاحیت اور (Manaoeuvre) سے بھاری افواج اپنے "دھڑ" سے کٹ سکتی ہے۔ ایک (Manaeuvre) سے وہ منقطع ہو سکتی ہے' ایک چال سے وہ گھیرے میں آ سکتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی صورت حال اگر نپولین جیسے جنرل کو درپیش ہوتی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا کہ وہ دشمن کو تلپٹ کر سکتا ہے اور اس کی چھاتی پہ بیٹھ سکتا ہے۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ "آج مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج تلپٹ ہو سکتی ہے"۔ کیا اس کی جان بخشی کر دی جائے؟ بھارتی افواج کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ کہ وہ پاکستان میں ایسے حکمران اوپر لائے جو اس کی جان بخشی کر دیں اور اس کو قتل عام کی خاموش اجازت دیئے رکھیں حتیٰ کہ کشمیری ریڈ انڈین کی طرح ختم ہو جائیں یا ہندو بنا لئے جائیں یا چند محدود علاقوں (Enclaves) میں رہ جائیں اور بھارت کا کشمیر پہ تسلط "پکا" ہو جائے۔ بھارت کے لئے یہ راستہ ڈپلومیسی اور فوجی طاقت کا ہے۔ "پاکستان سے امن کی پکار اور کشمیری مسلمانوں کا قتل عام" یہ ہموار راستہ ہے۔

دوسرا راستہ بھارت کے لئے "ناہموار" ہے کہ پاکستان کشمیریوں کے لئے میدان میں نکل آئے۔ بھارت کو اس صورتحال میں گیدڑ بھبکی دینی ہو گی کہ جنگ تمام علاقوں میں ہو گی۔ بھارتی فوج بڑی ہے اس کا خرچہ بھی زیادہ رہے گا۔ طویل جنگ بھارت کو ہلا کے رکھ دے گی۔ بھارتی افواج کو کم از کم چار علاقوں میں جنگ لڑنی ہو گی۔ (۱) کشمیر' (۲) پنجاب' (۳) سندھ اور (۴) سمندر۔

پاکستان کو بھی ان چار علاقوں میں لڑنا ہو گا۔ تو وہ بنیادی فیصلے کیا ہوں گے کہ ہم احسن طریقے سے چاروں محاذوں پر لڑ سکیں؟۔ وہ بنیادی فیصلے سٹرٹیجی کے ہیں۔ ہماری دفاعی سٹرٹیجی کیا ہو گی؟ ان علاقوں میں ہم کس طرح لڑیں گے؟۔ جواب یہ ہے کہ "کشمیر میں ہمیں (Strategic Offensive) یلغاری سٹرٹیجی رکھنی ہو گی۔" پنجاب میں ہمیں "عارضی سٹرٹیجک ڈیفنس" (Temporary Strategic Defence) کی سٹرٹیجی اپنانی پڑے گی۔ سندھ میں ہمیں "عارضی پسپائی" کی پالیسی اپنانی پڑے گی۔ سمندروں میں ہمیں اپنی ایئر فورس کو اس کی نیول فورسز کو تباہ کرنے پر استوار کرنا ہو گا۔ "دشمن کی نیول کی مکمل تباہی اور کشمیر پر قبضہ" یہ ہمارا جنگی ہدف ہو گا۔ یہ چار عدد حکمت عملیاں فتح سے ہمکنار کر دیں گی۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہم اپنا مافی الضمیر اور ارادہ ظاہر کر دیں گے تو بھارت اس سے فائدہ اٹھالے گا لیکن راقم اتنا احمق نہیں۔ دشمن کو شکست دینے کے اصل طور طریقے تقریباً دو درجن کے برابر ہیں اور تاریخ جنگ میں تقریباً ۱۳۰ طریقے ہیں۔

یہ چار طریقے بنیادی ڈھانچہ ہوں گے۔ مثلاً مقبوضہ کشمیر میں جارحانہ حملے کے لئے ہمیں (Dumping) کرنی ہو گی۔ پنجاب میں عارضی دفاع کے لئے ہمیں قلعہ بندیاں کرنی ہوں گی۔ سندھ میں عارضی پسپائی تو ہو گی لیکن علاقہ میں دیگر دشمن کا خون بہایا جائے گا۔ اس کو تھکا دینے کی حکمت عملی ہو گی۔ بالآخر "عقب سے اس کی تباہی" کی سٹرٹیجی ہو گی۔ چونکہ فضائیہ نیوی سے طاقتور ہوتی ہے اس لئے دشمن کی نیوی کو فضائیہ اور "آب دوزوں" سے ختم کرنا ہو گا۔ اپنی نیوی سے اپنے شہروں میں قلعہ بندی کے دوران "فائر پاور" مہیا کی جائے گی۔ اہم چیز یہ ہے کہ ہر جگہ دشمن کا عقب ہمارے قبضہ میں آ جائے۔ کشمیر پر قبضہ کا مطلب ہے دہلی تک شمال علاقوں پر قبضہ' تمام بھارتی افواج کا عقب اور مرکز ہمارے "پنجے" میں آ جائے گا۔ عقب کی کارروائیوں سے بھی بھارتی افواج تلپٹ ہو سکیں گی۔ جتنا علاقہ بھارت ہمارا لے گا اس سے دس گنا زیادہ علاقہ بھارت کھو دے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ جنگ کے بعد کشمیر کا کیا بنے گا؟ ہم لڑتے رہے اقوام متحدہ ہمیں رنگ سے باہر نکال کر خود قبضہ نہ کر لے۔ امریکہ قبضہ نہ کر لے تاکہ چین کے خلاف مقبوضہ کشمیر میں "طاقتور اور محفوظ اڈے" بنا لے۔ سمندروں تک وہ بھاری سامان لائے بلکہ ہمارے کوسٹ پر فضائیہ کے اڈوں سے وہ ساز و سامان اٹھا کر شمالی علاقوں میں چین کے خلاف ڈمپنگ شروع کر دے۔ کہیں چین اس خدشے سے میدان میں نہ کود پڑے اور کشمیر کی جنگ بین الاقوامی جنگ کا روپ دھار لے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کشمیر آزاد ہو گیا تو وہ افغانستان کی طرح "لینڈ لاکڈ" ملک ہو گا۔ سمندر تک تجارت کے لئے کس راستے سے جائے گا؟ پاکستان کے راستے جائے گا۔ افغانستان کی طرح وہ ہم سے راہ داری کے معاہدات کرے گا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر کشمیری مسلمان محفوظ ہو جائیں تو ہمارے لئے یہ فی سبیل اللہ جہاد ہی ہو گا اور یہی سب سے بڑا انعام ہے جیسے افغان جہاد کے دنوں میں یہ ثابت ہوا کہ افغانوں کی جان' مال' حرمت' عزت' بقاء' ان کی تجارت' سمندر تک کا راستہ' یہ سب پاکستان کے ساتھ منسلک ہے۔ بعینہٖ کشمیری مسلمانوں کی جان مال' حرمت' عزت' بقاء ان کی تجارت' سمندر تک کا راستہ یہ بھی پاکستان کے ساتھ منسلک رہے گا۔ کشمیری تو پاکستان کی خاطر کٹ رہے ہیں اور ہم ابھی تک شک کر رہے ہیں کہ "کیا وہ ہمارے ساتھ قدم ملا کر چلیں گے؟" کشمیری مسلمان تو پاکستان پہ جان و مال سے فدا ہیں۔ وہ ہمیشہ ساتھ چلیں گے۔

پاکستان تو تمام مسلمانوں کی "ماں" ہے اس ماں کے بچے ارد گرد پھیل سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ "ماں" اپنا رول ادا کرے۔ اپنے بچوں کو بچائے ان کے لئے لڑے لیکن ہم سوتیلی "ماں" بنے ہوئے ہیں۔ سوکن کی طرح بچے کو برباد ہوتا دیکھ کر خاموش ہیں۔ ماں تو خاموش نہیں رہ سکتی۔

جہاد افغانستان کے طویل سالوں نے افغانوں پر ثابت کر دیا کہ پاکستان ان کی پناہ گاہ ہے' اوڑھنا بچھونا ہے۔ جہاد کشمیر کے طویل سالوں کا بھی یہی تجربہ ہو گا کہ پاکستان ان کی پناہ گاہ ہے' اوڑھنا بچھونا ہے۔ پاکستان تو تمام دنیا کے مسلمانوں کا قلعہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ "کشمیر میں جو قتل عام ہو رہا ہے

وہ کیسے رکوایا جائے؟ ہم نے ساری دنیا کو پکارا لیکن ساری دنیا معذرت خواہانہ انداز اپنائے بیٹھی ہے تو ہم کیا کریں؟۔ پہلا کام یہ کریں کہ عالم اسلام کی جہاد کانفرنس بلائیں' فتویٰ جہاد لیں۔ دوسرا کام یہ کریں کہ سکھوں کی کانفرنس بلائیں' باہمی امداد و اتفاق کا عہد نامہ تحریر کریں' سکھ قوم ہاتھ جوڑ کر ہم سے معافی مانگے کہ "ہمیشہ ہندو کے سکھانے پر سکھوں نے مسلمانوں کو لتاڑا۔" وہ آئندہ ہمیشہ مسلمان قوم کا ساتھ دیں گے۔ سکھوں کے اس میثاق پہ انگوٹھے لگوائیں' ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان میں لانے اور بسانے کا معاہدہ کریں۔ ہندوستان ہندو کا نہیں۔ ایک ہزار سال سے مسلمان کا تھا۔ گاندھی نے ٹھگی کی' شودر کو ہریجن کہہ کر ہندو قوم کے ساتھ ملا کر جمہوری اکثریت کا دعویٰ کیا حالانکہ شودر (ہریجن) کو کبھی اپنی قوم کا حصہ نہ سمجھا۔

برصغیر میں تین قومیں آباد تھیں ہندو' مسلمان اور ہریجن۔ ہریجنوں کو اسلام زیادہ پسند تھا کیونکہ اس طرح وہ سماجی برابری حاصل کر لیتے تھے۔ ہندو کبھی برابری نہیں دیتا۔ گاندھی نے جنوبی افریقہ سے ہندوستان آتے ہی بھانپ لیا کہ جب تک ہریجنوں کو ساتھ نہیں ملایا جاتا ہندو کبھی سلطنت برطانیہ کا وارث ثابت نہیں ہو سکے گا۔ برطانیہ نے تو سلطنت ہند مسلمانوں سے چھینی تھی ہندو سے تو نہیں سلطنت چھینی تھی اس کو واپس دے جاتا لیکن یہاں فرنگیوں کی اسلام دشمنی نظر آتی ہے کہ انہوں نے دیدہ دانستہ مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وراثت ہند سے ختم کرنے کے ارادے سے ہندو کی مصنوعی اقلیت منظور کر لی اور بھارت کو وسیع جغرافیائی علاقے دے گیا تاکہ ان علاقوں کی مدد سے وہ مہابھائی انداز کی بڑی فوج بنا کر مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ بابری مسجد اس سلسلے کا پہلا واقعہ ہے۔

اب اصول یہ ہے کہ جہاں فوج نہ ہو' جہاں آبادی مسلح نہ ہو' جہاں سے فوج بھاگ جائے' جب فوج کھوکھلی ہو جائے (ایران کی مثال) وہاں جنگ کی صورت میں اس قوم کے بچے ذبح ہونے لگیں گے۔ فوج نہیں لڑے گی تو "فوجی قبرستان" کی بجائے "بچوں کے قبرستان" بھر جائیں گے۔ فوج اسی لئے ہوتی ہے کہ قوم محفوظ رہے۔ "فوج بچاؤ' قوم گنواؤ" یہ ہے فوج بنانے کی اصل وجہ؟۔

اس لئے پاکستان کی افواج برصغیر ہی نہیں پورے اسلام کے تحفظ کی فوج ہے' بلکہ پوری انسانیت کے تحفظ کی فوج ہے۔ اس کو لڑنے سے ہرگز گریز نہیں کرنا چاہئے۔ معصوم مسلمان بچوں کی چیخوں نے شاید عرش ہلا دیا لیکن "یہ گل محمد جنبش نہیں کر رہا!!"۔ پاک فوج جہاں لگن' ایمانداری' جہاد کے جذبے سے سرشار ہو کر ۱۹۴۸ء میں کشمیر کے لئے جنگ لڑی تو کشمیر کا ایک بڑا حصہ آزاد کشمیر ہندوستانی پنجہ استبداد سے محفوظ ہو گیا۔ کام آدھا ہوا کام پورا ہونا چاہئے۔ ہمیں سانس مل گیا' ہم نے فوج بنا لی۔ اب سارا کام ختم کرنا ہو گا تاکہ سارے کشمیر' سارے مشرقی پنجاب' بلکہ ساری ہندوستانی اقوام کو بھارت کے پنجہ استبداد سے محفوظ کر دیں۔

ابھی ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم نے یہود و نصاریٰ کی سکھلائی ہوئی جمہوریت کا ساتھ دینا ہے یا اسلامی جمہوریت کو اپنانا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی جمہوریت میں یہود بینکار اور یہودی پریس ہی سیاست دان کو اٹھاتا بٹھاتا ہے' آگے بڑھاتا ہے' نیچے گراتا ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اموال کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دے دیا جاتا ہے۔ آپ نے سوچنا ہے کہ اموال پاکستان کو بھٹو صاحب کے خاندان کے حوالے کرنا ہے یا اللہ کے؟ جمہوریت لینی ہے تو بے نظیر آ جائیں گی۔ وہ دشمنان اسلام سے ڈیل کر لیں گی۔ مسلمانوں کو بنیاد پرستی کی گالی جیسے مصر کے حسنی مبارک کے جج اور فوجی عدالتوں کے جج مسلمانوں کو "عسکریت پسند" کہنے لگے ہیں اور پھانسیوں پر ٹانک رہے ہیں۔ ویسے پاکستان میں بھی کام شروع ہو جائے گا۔

مصر کی جمہوریت یا ڈکٹیٹر شپ نے کیا دیا ہے؟ الٹا دشمن ان پر حاوی ہو گیا۔ حسنی مبارک نے دشمنان اسلام سے چند بلین ڈالر کا سودا کر کے اسلام بیچ دیا۔ شاید ہمارے حکمران بھی بیچ دیں گی لیکن مسلمان سلطان' خلیفہ' صدر نہیں بیچے گا۔ کیا ایمان بیچنے کی چیز ہے؟ میرے والد کہا کرتے تھے کہ "جان جاتے دیکھو تو مال لٹا دو' ایمان جاتا دیکھو تو جان لٹا دو۔" اگر پاکستان کا آئین اسلامی ہے اور جمہوری لیڈر اس کو اسلامی نہیں رکھنا چاہتے تو ہمارے دو راستے ہوں گے۔ آئین کو غیر اسلامی بنا دیں یا اس نام نہاد جمہوری لیڈر کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں جو پاکستان کے آئین کو غیر اسلامی بنانے پر تیار ہے۔ میرے خیال میں ہماری فوج کو طاقت سے آئین کو اسلامی رکھنا ہو گا۔ فوج خاموش رہے اور کوئی حسنی مبارک پورے ملک کو بدل دے' غیر اسلامی کر دے' ڈالروں کا غلام بنا دے تو فوج' اسمبلی و عدلیہ سب کا مواخذہ کرنا چاہئے۔OO

نیر زیدی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ جنرل عبدالوحید پاکستان سے پی پی پی مافیا کو نکال باہر کریں گے (امپیکٹ' نومبر ۱۹۹۴ء)۔ لیکن بے نظیر بھٹو نے جو معاملہ عدلیہ کے ساتھ کیا ہے وہی کچھ پاکستانی جنرلوں کے ساتھ بھی کر لیا ہے لہٰذا جنرل صاحبان کو پی پی سے کوئی شکایت نہیں اور پھر انہیں اسلام آباد میں مقیم امریکی وائسرائے کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ نیر زیدی ان حقائق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کل کے "مسٹر ٹین پرسنٹ" آج "مسٹر تھرٹی پرسنٹ" بن چکے ہیں اور مافیا جنرلوں سے بنا کر رکھنے کا گر جان گیا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جو شخص ایک سینما کا مالک تھا کہا جاتا ہے کہ آج اس کے تین شوگر ملوں میں نوے فیصد حصص اور چوتھی مل میں پچاس فیصد حصص ہیں جبکہ کوٹری میں ایک سیمنٹ فیکٹری الگ تیار ہو رہی ہے۔

کراچی میں متعدد شاپنگ پلازے زرداریوں کی ملکیت ہیں۔ سانگھڑ میں پچپن ہزار ایکڑ کا ایک مویشی فارم قائم کیا جا رہا ہے جسے مغربی نارو اور کوٹری کی نہریں سیراب کریں گی۔ یہ وہ چند باتیں ہیں جو میں نے حال ہی میں پاکستان جانے پر سنیں۔ اگر عوام میں جان ہوتی تو کسی تبدیلی کا امکان بھی تھا۔ مگر عوام اپنی جگہ خود غرضی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہیں۔ انہیں اپنے مسائل کے حل کے لئے نہ تو اسلام سے دلچسپی ہے اور نہ کوئی اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے قربانی دینے کو تیار ہے۔ (امپیکٹ' دسمبر ۹۴ء)

معین قریشی واشنگٹن میں عالمی بینک کی ملازمت سے فراغت حاصل کر چکے تھے کہ ۱۹۹۳ء کے سرما میں ایک رات اسلام آباد پہنچ کر ملک کے عبوری وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ نواز شریف کے استعفیٰ کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کے پاس امریکہ سے وزیر اعظم درآمد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ترکی کی وزیر اعظم' تانسو شلر کی طرح معین قریشی بھی امریکی شہری خیال کئے جاتے ہیں گو ان کا پاسپورٹ راز میں رکھا گیا مگر وہ امریکہ میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ منتخب صدر' فاروق لغاری صاحب بھی امریکی گرین کارڈ رکھتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ انہوں نے خود صدر صاحب سے اس بارے میں پوچھا تھا مگر انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے ۱۷/مارچ ۱۹۹۳ء کو امریکہ کے بالٹی مور ہسپتال میں انتقال کیا جہاں وہ جان بکسی کے نام سے داخل تھے۔ چنانچہ ایک عیسائی پادری نے ان کی آخری رسومات ادا کیں۔

بہرحال سردار عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ لغاری صاحب کے گرین کارڈ پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں' اس ضمن میں اور بھی کئی نام ہیں۔ (امپیکٹ' دسمبر ۹۴ء)

اقتدار احمد

ہمارا رہبر خود بھی ہماری طرح ایک اجنبی تھا

سلطنتِ عثمانیہ کے پہلے دارالحکومت بُرصہ کا سفر

ستاروں نے تو خلافت کے مزار پر ایک شخص کو "قم باذن اللہ" کہتے دیکھ ہی لیا

دیوان ریستوران کے اس پُرتعیش عشائیے میں ازانِ خلافت نے استنبول کی فضا میں تو ارتعاش پیدا کر ہی دیا تھا جسے ۶۸ برس پہلے کمال شاہی فرمان کے تحت اسی شہر سے ملک بدر کیا گیا اور ملک بدر پر ہی کیا موقوف' کرۂ ارضی سے برکاتِ خلافت کو گویا بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تحریکِ خلافت پاکستان کے داعی کی باتیں ہمارے ترک بھائیوں کی سمجھ میں نہیں آئیں تو کیا ہوا' پونے پانچ سو سال "دارالخلافہ" رہنے والے شہر کے زمین و آسمان نے تو سن ہی لی تھیں۔ زمین وہ جس کا ذرہ ذرہ اس شان و شکوہ کی یادوں کا بارِ امانت اٹھائے اب تھکنے پر آگیا ہے' ماضی جس سے عبارت تھا لیکن حال بالکل خالی اور مستقبل قریب میں بھی جس کی بازیافت کا امکان نظر نہیں آتا.... اور اب تو آسمان پر تارے بھی جھلملانے لگے تھے۔ برقی روشنی کی مصنوعی چکاچوند میں ہمارے لئے وہ ماند نہ پڑ گئے ہوتے تو ان کے مچلے چہروں پر مسکراہٹوں کا رقص ضرور دیکھتے جو خلافت کے مزار پر "قم باذن اللہ" کہنے والے ایک شخص کو ایک زمانے کے بعد خلافت کا نعرہ لگاتے خود اپنے کانوں سن رہے تھے ورنہ یہاں تو مجھ ایسے عزادار بھی کم کم ہی آتے ہیں جو خلافتِ عثمانیہ کا دبدبہ یاد کر کے چپکے چپکے بس آنسو بہا کر دل کی بھڑاس نکالتے اور آہیں بھرتے اپنا راستہ لیتے ہیں۔

آئی ایم اے کنونشن کی آخری تقریب کے اختتام پر ہم زیرِبار شکم اور سوگوار دل کے ساتھ اپنے مستقر پر واپس پہنچے اور جوں توں نمازِ عشاء کی ادائیگی کے بعد نیند کی پناہ میں چلے گئے۔ دن بھر کی تکان اور اس پر مستزاد جذبات واحساسات کے ہیجان نے تھکا مارا تھا ورنہ تو نیند یا ہماری بے چینی کو گلے لگانے کے لئے نہ جانے کتنی لوریوں کے بعد آمادہ ہوتی۔ اللہ کی بنائی ہوئی لاتعداد نعمتوں میں سے خود نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ "اور وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم لوگوں کے لئے رات کو پردہ پوش' نیند کو (موجب) راحت اور دن کو (گویا) جی اٹھنے کا وقت بنا دیا" (سورۃ الفرقان' آیت ۴۷)۔ صبح کو زندگی کی نئی مہلت کے ساتھ بیدار ہوئے اور اس مہلت پر اللہ کا شکر بجالانے کے بعد فجر کی نماز دو نفری جماعت کی صورت اپنے کمرے میں ہی پڑھی کیونکہ "مسجد" کی بساط لپیٹی جا چکی تھی یعنی وہ سفید چادریں گزشتہ شب ہی ہوٹل کے عملے نے تہہ کر دی تھیں جنہوں نے مرمرہ کے نائٹ کلب کے اس "بال روم" کے ناپاک یا کم از کم مشکوک قالین کو جائے نماز بنائے رکھا۔ ہماری صراحت پر آئی ایم اے نے ہوٹل انتظامیہ کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم لوگ ایک دن اور ان کے خرچ پر یہاں قیام کریں گے لہٰذا ہمارا ناشتے کا حق اس روز محفوظ تھا اور اگلے دن کے لئے بھی جب دس گیارہ بجے قبل از دوپہر ہمیں ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔

نمازِ فجر کے بعد ہم نے ڈاکٹر سید ارشد حسین صاحب کو ان کے کمرے میں فون کیا۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔ برادر محترم سے ان کی پرانی شناسائی تھی۔ امریکہ کی شہریت قبول کر لینے سے پہلے ان کا تعلق بھی ہمارے وطن پاکستان ہی سے تھا۔ ان کے والد کا شمار جماعت اسلامی پاکستان کے نمایاں اراکین میں ہوتا تھا۔ ان کا اسم گرامی سید مختار حسین تھا۔ ماچھی گوٹھ کے تاریخی اجتماع میں کراچی والے مرحوم ڈاکٹر عثمانی اور ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے "باغیانہ" طرزِ عمل نے انہیں اس درجہ بیزار کیا تھا کہ وہ یہ کہتے سنے گئے کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو بھی "ڈاکٹر" نہیں بنائیں گے لیکن "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"۔ یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ان کے سب بچے' لڑکے ہوں یا لڑکیاں' ڈاکٹر ہی بنے اور وہ خود بھی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عثمانی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی طرح بددل ہو کر جماعت کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ڈاکٹر ارشد نے بُرصہ کے سفر میں ہمارا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس سیر میں شریک رہنے کے علاوہ ان کی غرض یہ بھی تھی کہ برادر محترم سے ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہے جو دراز ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں بھی بطور سامع اکثر اس میں شامل رہا اور محسوس کرتا رہا کہ وہ مسلمان جو ایمان و اسلام کے تقاضوں سے تو آگاہ ہیں لیکن اکثر صورتوں میں خود ساختہ مجبوریوں کے دباؤ میں آ کر دیارِ مغرب کے اسیر ہی نہیں ہو گئے بلکہ سنہری زنجیروں میں پوری طرح جکڑے بھی جا چکے ہیں' ہم جیسے دیوانوں سے آمنا سامنا ہونے پر اپنے ضمیر کی خلش مٹانے کے لئے دانشوری کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ حضرات کھانے کمانے کے لئے نہیں بلکہ اسلام اور امت مرحومہ کے غم میں دبلے ہوتے رہنے کے لئے ہی امریکہ یا کہیں یورپ میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں خلوص و اخلاص کی دولت سے مالامال لوگ بھی ہوتے تو ہیں لیکن خال خال۔ ان مخلصین میں سے بعض احساسِ فرض کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے وطن کی طرف مراجعت بھی کرتے ہیں لیکن یہاں کی ناقابلِ برداشت دشواریوں اور اذیتوں سے گھبرا کر واپسی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے۔ چنانچہ انگلیوں پر گنے جا سکنے والے معدودے چند ہی لوگ دل میں "ہرچہ بادا باد" کا فیصلہ کر کے کھال موٹی کر لینے میں کامیاب ہوتے اور ہر سختی جھیل کر بھی مغربی معاشرے کا حصہ نہ بننے کے اپنے عزم پر قائم رہ سکے ہیں۔

اس سفر میں اپنے ہمراہی ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ لے کر ہم تینوں نے اول وقت ناشتہ کیا اور واپسی پر دیکھا کہ عزمے حسبِ سابق وقت سے پہلے ہی پہنچا ہوا ہے۔ علیک سلیک کے بعد اسے ذرا دیر انتظار کا کہہ کر ہم نے روانگی کے لئے تیار ہونے کے لئے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا اور ذرا کی ذرا میں ہم سب پھر لاؤنج میں جمع ہو گئے تھے۔ لاؤنج میں اب رونق اور آمدورفت بہت بڑھ چکی تھی۔ کنونشن کے اکثر شرکاء کسی نہ کسی سیر و تفریح کا پروگرام بنائے ہوئے تھے' واپسی کے لئے براہِ راست یا عمرہ کا اضافی فائدہ اٹھانے کی غرض سے براستہ جدہ روانہ ہونے والے اگرچہ کم تھے لیکن مصروف سب سے بڑھ کر۔ وہ رختِ سفر باندھ چکے تھے اور اپنا سامان لا کر لاؤنج میں ڈھیر کر رہے تھے۔ ہم ایک کونے میں آمنے سامنے دو صوفوں میں دھنس گئے جہاں شور شرابہ ذرا کم تھا۔ عزمے نے جو معلومات جمع کی تھیں ان کا جائزہ لے کر متبادل ذرائع سفر میں سے اپنے لئے کسی ذریعے کا انتخاب ہماری اس "کارنر میٹنگ" کا موضوع تھا۔ ایشیائی ترکی یعنی اناطولیہ میں واقع شہر بُرصہ تک پہنچنے کے تین طریقے تھے۔ براہِ راست بس کو استعمال کر کے جو یورپ کو ایشیا سے ملانے والے آبنائے باسفورس پر دو بڑے معلق پلوں میں

سے ایک پر سے ہوتی ہوئی تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کا پورا سفر سڑک کے ذریعے طے کرتی ہے۔ دوسرا بس اور فیری سروس کا امتزاج جس میں بحر مرمرہ کو باسفورس سے ملحق کم سے کم چوڑائی عبور کرنے کے لئے فیری سروس کو استعمال کیا جاتا ہے اور تیسرا زمینی اور طویل تر سمندری سفر میں ایک مختلف لیکن حسین تناسب سے ترتیب دیا گیا روٹ جو سب سے زیادہ دلکش محسوس ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنے بہت سے انتظامات سیاحوں کی دل بستگی کے لئے کئے گئے ہیں ورنہ اہنائے وطن کے لئے اتنا کھکھیڑ کون مول لیتا ہے!۔

ہم نے خالص زمینی سفر کو تو بالکل مسترد کر دیا' جانے کے لئے زمینی اور سمندری سفر کا ایک متبادل اور واپسی کے لئے دوسرا پسند کیا۔ اللہ کا نام لے کر ہوٹل سے اپنی پہلی انفرادی مہم جوئی پر نکلے۔ مرمرہ ہوٹل کے پورچ میں ہی کئی پیلی ٹیکسیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں' ہمارے اشارے پر ایک نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور چند ہی منٹوں میں ہمیں "کباتاش" کی "بندرگاہ" پر جا اتارا۔ ایک بڑے گیٹ سے گزر کر ہم ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے جہاں مختلف سمتوں میں ٹکٹ کی کھڑکیوں پر الگ الگ مقامات کے نام درج تھے اور ساتھ ہی ٹکٹوں کی شرح کے بورڈ بھی آویزاں تھے۔ یہاں سے "بحری بسیں" چھ سات جگہوں کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ ہماری منزل "یلووا" تھی جس کا کرایہ فی کس ڈیک کے لئے بیس بائیس ہزار ترکی لیرے تھا اور کیبن کے لئے تیس ہزار لیرے سے کچھ زیادہ۔ یلووا کے لئے یہ چھوٹا جہاز آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونے والا تھا (وہاں موٹر بوٹ کے لئے "بحری ٹیکسی" اور تیز رفتار چھوٹے بحروں کے لئے "بحری بسوں" کی اصطلاح عام استعمال ہوتی ہے)۔ ہمارے ساتھی ڈاکٹر صاحب میزبانی کے موڈ میں تھے' ان کے تیور دیکھ کر میں جھٹ سے جا کر لائن میں لگ گیا اور اپنا بٹوہ جیب سے نکالا ہی تھا کہ انہوں نے اپنے کندھے سے میرے شانے کو دھکیلتے ہوئے میری جگہ پر قبضہ کر لیا اور اصرار کیا کہ ٹکٹ وہ خریدیں گے۔ مجھے ہار ماننی پڑی۔

ہال سے سمندر کی طرف جانے والے راستوں میں سے ایک پر یلووا کا بورڈ لگا ہوا تھا' اس کے ذریعے برآمد ہو کر ہم نے ایک تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے اپنے جہاز کا رخ کیا۔ اس راستے کے دونوں طرف پائپ کا حفاظتی جنگلا لگا ہوا تھا اور "بحری بس" اس کے ساتھ ہی لگی کھڑی تھی۔ ہم کیبن یعنی درجہ اول کے مسافر تھے لہٰذا جہاز میں داخل ہوتے ہوئے ٹکٹ دکھانے پر سیدھے اندر بھیج دیئے گئے جب کہ ڈیک یعنی درجہ دوم کا ٹکٹ رکھنے والے زینہ کی طرف بھیجے جا رہے تھے جو اوپر کھلے آسمان کے نیچے بنچوں پر جا کر بیٹھیں گے۔ کیبن کا اندرونی ماحول چوڑے اور بڑے مسافر ہوائی جہازوں جیسا تھا۔ نشستوں کے درمیان ویسے ہی راستے جیسے جمبو جیٹ یا ائربس میں ہوتے ہیں۔ نشستوں کے اوپر دستی سامان رکھنے کے ویسے ہی ریک اور اپنی سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد دیکھا کہ نشستوں کی ساخت بھی بالکل وہی تھی جو ہوائی جہازوں میں ہوتی ہے۔ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہوا بند کھڑکیاں مرطوب سمندری ہوا سے محفوظ رکھنے کی غرض سے سنٹرل ایئر کنڈیشنگ' نشستوں کی پشت کو مطلوبہ زاویے پر جھکا کر رکھنے کا وہی انتظام' سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لئے ہر سیٹ کے بازو پر ویسی ہی ایش ٹرے اور سر کے اوپر سامان کے ریک کے نیچے ہوا کو کم و بیش کرنے کے علاوہ میزبان حضرات و خواتین کو طلب کرنے کی غرض سے "کال بٹن" رکھنے والا ویسا ہی ایک پینل جو ہوائی جہازوں میں ہوتا ہے۔ کیبن کے ساؤنڈ سسٹم سے ہلکی سُروں میں استقبالیہ موسیقی بھی چل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیبن کی تمام نشستیں پُر ہو گئیں اور روانگی کے اعلان کے ساتھ جہاز نے لنگر اٹھا لیا۔ ساؤنڈ سسٹم سے ہلکی موسیقی کے ساتھ وقفے وقفے سے نوواردوں کی معلومات کے لئے دائیں بائیں نظر آنے والی عمارات وغیرہ کی تفصیل بتائی جاتی رہی۔ ہلکے (soft) مشروبات کا دور بھی چلا جبکہ پینے کی "خاص" چیزوں اور ماکولات کو اضافی ادائیگی پر طلب کیا جا سکتا تھا۔

ہماری بحری بس کی رفتار خاصی ہی سبک اور تیز تھی' وہ آبنائے باسفورس کا سینہ چیرتی پندرہ بیس منٹ میں ہی بحر مرمرہ میں داخل ہو گئی جہاں سے اگرچہ ایک جانب استنبول کا یورپی ساحل نظر آتا تھا تاہم دوسری جانب حد نگاہ تک پانی کی سلوٹوں والی چادر تھی اور واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا کہ ہم کسی ندی نالے یا جھیل کی سیر پر نہیں نکلے بلکہ واقعی ایک سمندر کی آغوش میں ہیں۔ قرآن مجید نے چودہ صدی پہلے اپنے اولین مخاطبوں کو جن مظاہر قدرت اور مختلف حالتوں میں انسان کی اپنی اندرونی کیفیات کی طرف متوجہ کر کے وجود باری تعالیٰ کے جو شواہد پیش کئے' وہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی وہی تاثیر رکھتے ہیں۔ جو امن و سکون اور اطمینان آدمی زمین پر رہ کر محسوس کرتا ہے وہ نہ پانی پر تیرتے میسر آتا ہے نہ فضا میں پرواز کرتے۔ اللہ زمین پر رہتے اتنی شدت سے یاد نہیں آتا جتنا سمندر کی لہروں پر ڈولتے ہوئے اور ہوا میں معلق رہ کر آتا ہے۔ ہمارے آس پاس اکثر یورپی مسافروں نے بیئر کے ڈبے منگا لئے تھے اور کچھ وسکی کی ننھی منی بوتلوں (Mini bottles) سے شغل فرما رہے تھے' میرے دونوں بزرگ ڈاکٹر صاحبان سنجیدہ تبادلۂ خیال میں محو تھے' ہمارا ترک ساتھی عزمے میری طرح باہر کے منظر میں گم تھا جبکہ مجھ پر سورۂ ابراہیم کی ایک آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم طاری تھا کہ "وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانہار" - دریاؤں اور سمندروں کو اور ان کے سینے پر سوار کشتیوں جہازوں کو کیا اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کے لئے مسخر نہیں کیا۔ انسان نے تو بس اتنا ہی تیرا ہے نا کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی اشیاء کی ماہیت و خاصیت معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیب سوچی بلکہ اس کی طرف رہنمائی کا انتظام بھی خود اللہ تعالیٰ نے بڑے لطیف انداز میں کیا۔ مثلاً لکڑی کے کسی ٹکڑے کو پانی پر تیرتے دیکھ کر ہی ہمارے آباء و اجداد کو کشتیاں بنانے کا خیال آیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے میں یلووا پہنچتے ہوئے ہمارا گزر "پرنس آئی لینڈز" سے ہوا۔ شہزادوں اور شہزادیوں سے منسوب یہ نو چھوٹے بڑے جزیرے اپنے مناظر فطرت اور قدرتی حسن کے لئے معروف ہیں ورنہ وہاں سڑکیں ہیں نہ موٹر گاڑیاں اور نہ کوئی عجائب گھر وغیرہ۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر پگڈنڈیوں پر گھوما پھرا جاتا ہے اور جنگل میں ہموار لیکن کچے راستوں پر بگھیاں دوڑائی جاتی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑے جزیرے کا نام "بویوکدہ" ہے جس کے بعد کنالی' برآز اور ہیبلی کا نمبر آتا ہے جبکہ باقی پر تو جزیرے ہونے کی بس تہمت ہی جڑ دی گئی ہے۔ لوگ یہاں پکنک منانے اور پورے پورے دن کی سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں لیکن ہم نے دور سے نظارا ہی کیا اور "پرنس آئی لینڈز" ہی کیا' ہمیں تو اکثر چیزوں کا "دور کا جلوہ" ہی میسر آتا ہے جس سے یہ اندازہ البتہ ہو جاتا ہے کہ جنت میں خوش نصیبوں کو مہیا کی جانی والی جن نعمتوں کا ذکر قرآن مجید میں نت نئے پیرائے میں بار بار آتا ہے' وہ کیسی ہوں گی۔ وہ کسی نے دیکھیں نہ سنیں لیکن خود اللہ میاں جب ہماری دیکھی بھالی چیزوں سے ان کی مشابہت کا ذکر فرماتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ ہمارے تصور و تخیل کو کمک پہنچانے کا ہی اہتمام ہے۔

ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب جنت میں داخلے کا اعزاز پانے والے بالفاظ قرآنی "قلیل" ہوں گے اور اپنا حال یہ ہے کہ "عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں غالبؔ' آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"۔ زندگی بتان وہم و گماں کے پیچھے دوڑ لگاتے گزار دی' سانس پھول جانے پر رکنے کی مجبوری لاحق ہوئی تو خیال آیا کہ یہ کھیل تو اب خاتمے پر ہے' آگے کیا ہو گا؟۔ توبہ کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو کہاں جاتے!۔ اب تک بھی لے دے کے جو توشۂ آخرت مہیا ہوا ہے' اسے بہت سے بہت معذرت کی گنجائش قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اور ہوں گے جو جنت پر حق جتلا سکیں' اپنا تو اللہ میاں کی رحمت پر انحصار ہے۔ وہ رحم ہی کرے' ترس کھائے تو جنت کے "سروس ڈیپارٹمنٹ" میں بطور مددگار بھرتی کر لے ورنہ..... اے اللہ میں اس "ورنہ" سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور پورا اطمینان رکھتا ہوں کہ تو میرے ظاہر و باطن سے خوب آگاہ ہے۔ تیرے علم میں ہے کہ مجھے کیا دے کر تو نے کن حالات میں گزر بسر کے لئے اس دنیا میں' دھوکے کی اس ٹٹی میں بھیجا اور یہ بھی کہ غلط سلط راہوں پر چلا بھی تو اناڑیوں کی طرح چلا' اس خرابے میں رہا بھی تو کسی اجنبی

کی طرح اور بے چین رہا۔ سکون تو اب تیری امان میں آ کر ملا ہے۔ "نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی۔ مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں"۔

کھڑکی کے راستے باہر کے مناظر کو حافظے کی لوح پر محفوظ کرتے اور اپنے من کے اندر جھانکتے یہ سفر اختتام کو پہنچا اور بیلووا پر اتر کر ترکی کے ایشیائی حصے یعنی اناطولیہ پر ہم نے پہلا قدم رکھا۔ گھاٹ پر واقع عمارت کے جس دروازے سے ہم برآمد ہوئے اس کے عین سامنے کئی بسیں مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ بسوں کے اس ٹرمینل کے پار ایک بڑی سڑک تھی جس کے دوسری طرف اس بستی کا بازار نظر آتا تھا جہاں شہری زندگی کے معمولات اپنی فطری روانی کے ساتھ جاری تھے۔ ماحول پر مغربیت کی چھاپ یہاں بھی تھی لیکن استنبول کے مقابلے میں بہت ہلکی۔ اطراف و جوانب کو جانے والی سب بسوں کے ٹکٹ ایک ہی کھڑکی سے فروخت کئے جا رہے تھے۔ ہمارے خود ساختہ میزبان ڈاکٹر صاحب ادھر کو لپکے تو میں نے احتجاج کیا اور ان سے درخواست کی کہ خرچ میں کچھ حصہ مجھے بھی ڈالنے دیں۔ میں نے الفاظ کچھ زیادہ ہی زور دار استعمال کئے ہوں گے جو ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور عزمے کے ساتھ جا کر ٹکٹ میں نے خریدے۔ بُرصہ کے لئے دس بارہ ہزار ترکی لیرے فی کس کرایہ تھا۔ بس کی روانگی میں زیادہ دیر نہ تھی' ہم نے ایک نزدیکی کھوکھے (Kiosk) سے محض داڑھ کو گرم رکھنے کے لئے مقامی ساخت کے کچھ بسکٹ سے خرید سے جن کی طرف ہم بھوک مٹانے کے لئے نہیں بلکہ ان کی شکل و صورت سے متاثر ہو کر مائل ہوئے تھے۔ صورت و سیرت میں یکساں لطیف یہ بسکٹ چباتے ہم بس میں سوار ہوئے تو باآواز بلند ہمارے سلام کے جواب میں پہلے سے بیٹھے ہوئے مسافروں نے از خود آگے پیچھے ہو کر آمنے سامنے کی ایک پوری لائن ہمارے لئے خالی کر دی تاکہ ہم چاروں اکٹھے بیٹھ سکیں۔ مسافروں میں سیاح بہت کم اور مقامی ترک زیادہ تھے جن کا تعلق متوسط طبقے سے لگا۔ لشکر کی نگاہوں میں بالخصوص ہم دونوں بھائیوں کے لئے وافر اور گہرا احترام تھا جبکہ نسبتاً "اپ ٹو ڈیٹ" قسم کے چند صاحب بہادروں کی تیوریاں چڑھی بھی دیکھیں۔

اب ہمارا رخ برصہ کی طرف تھا۔ ہم اکہری لیکن مناسب چوڑائی رکھنے والی سڑک پر سفر کر رہے تھے جس پر کاروں' بسوں' ٹرکوں اور بڑے ٹریلروں کا ٹریفک بس اتنا ہی تھا جیسا دن کے وقت ہماری لاہور ملتان روڈ پر ہوتا ہے۔ سڑک کی حالت بری نہ تھی۔ ڈرائیوروں میں سلیقے اور قوانین کی پابندی کا رجحان یہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ محسوس ہوا جس کے باعث گاڑیوں کی رفتار میں یکسانیت پائی گئی اور قدم قدم پر جیسے یہاں گاڑیوں کو بریک استعمال کرنے پڑتے ہیں' وہ کیفیت وہاں موجود نہ تھی۔ برصہ تک کے پورے راستے میں ہمارا گزر اسی طرح کی سطح مرتفع سے ہوا جس طرح کا ہمارے پوٹھوہار کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔ لیکن سرسبزی و شادابی یہاں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ پوپلر اور اخروٹ کے درخت بہت عام ہیں۔ وادیوں میں سبزیوں کے تہہ دار تختے اور جابجا زیتون کے جھنڈ پائے جاتے ہیں۔ آڑو' خوبانی اور آلوچے جیسے پھلوں کے باغات بھی جابجا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا علاقہ بارانی ہے لیکن بارانِ رحمت یقیناً حسبِ ضرورت میسر آتی ہوگی۔ البتہ بُرصہ کے قریب پہنچنے تک ہموار میدانی علاقہ شروع ہو گیا جس کے پس منظر میں برصہ کے افق کو ایک بلند و بالا پہاڑی سلسلے نے گھیر رکھا ہے۔

برصہ کے قصبہ کی بنیاد دوسری صدی قبل مسیح میں پروسیا نامی ایک بادشاہ نے رکھی تھی جس کے نام کی مناسبت سے سے اسے پروسہ کہا جانے لگا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ نام بروسہ یا بروصہ ہو گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں اناطولیہ میں قائم ہونے والی عثمانی ترکوں کی پہلی سلطنت کا دارالحکومت بننے پر اسے برصہ کہا جانے لگا لیکن یہ اعزاز اس شہر کو زیادہ عرصہ حاصل نہ رہا کیونکہ قسطنطنیہ کے پار یورپ کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لینے کے بعد دارالسلطنت کو اسی طرف "ادرنہ" کے مقام پر منتقل کر دیا گیا جہاں سے بالآخر دارالخلافہ نے اگلی پانچ صدیوں کے لئے قسطنطنیہ کو اسلامبول اور پھر استنبول بنا کر رونق بخشی۔

ہم اب برصہ کے نواح میں داخل ہو چکے تھے جو ہمارے کسی اچھے ضلع کے صدر مقام کے نواح سے ملتا جلتا تھا۔ سڑکیں زیادہ کشادہ اور اکثر حصوں میں دو رویہ ہو گئی تھیں۔ ٹریفک بھی بڑھ گیا تھا لیکن نظم و ضبط میں بھی اسی نسبت سے اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پھر شہر کے بازاروں کے بھیڑ بھڑکے میں سے گزر کر جب ہماری بس مقامی ٹرمینل یعنی بسوں کے اڈے پر آ کر رکی تو دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے گویا استنبول سے برصہ پہنچنے میں ہمیں چار ساڑھے چار گھنٹے لگے۔

بسوں کے اڈے پر ہی ایک پُرہجوم عوامی ریستوران میں بیٹھ کر ہم نے کوکا کولا سے پیاس بجھانے کے بعد بغیر دودھ کی چائے سے سفر کی تکان اتارتے ہوئے اپنا پروگرام مرتب کرنے کا سوچا اور عزمے سے رہنمائی طلب کی کہ یہاں کیا کچھ اور کیسے دیکھا جائے تو انکشاف ہوا کہ ہمارا رہبر خود بھی ہماری طرح زندگی میں پہلی بار استنبول سے باہر نکلا ہے۔ اس غریب کو سیرو سفر کی یہ "عیاشی" قبل ازیں کبھی میسر آئی ہی نہ تھی جس کے مزے وہ ہمارے ساتھ لُوٹ رہا تھا۔ اس انکشاف پر ہمیں غصہ بھی آیا اور عزمے کی نارسائی پر ترس بھی۔ اب مجھے یاد آیا کہ سارے رستے وہ خود بھی مجھ سے زیادہ محوِ تماشا رہا بلکہ اس کی محویت کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ برادر محترم نے جھنجلا کر عزمے سے کہا کہ اچھا بابا' اب یہاں لوگوں سے پوچھ کر ہی ہمیں بتاؤ کہ دو چار گھنٹوں کا بہتر سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا' وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر اسی نوع کی سفارتی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا جس قسم کی کوششوں کا مظاہرہ ہمارے معزز نمائندے انہی دنوں کشمیر پر اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے مسلم ممالک کی رابطہ کونسل کی طرف سے پیش کی جانے والی مجوزہ قرارداد کے سلسلے میں کر کے تشریف لائے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ اس کے سفارتی نکتوں میں سے ایک نے تیر کا کام دے ہی دیا اور وہ ایک بوڑھے ترک کو ہمارے پاس لانے میں کامیاب ہو گیا جو مقامی تو تھا ہی' خاصا معتبر بھی نظر آتا تھا۔OO (باقی باقی)

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکامِ پاکستان

اشاعت خاص ۵۰ روپے

اشاعت عام ۳۵ روپے

قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون: ۸۵۲۶۱۱

پاکستان کیوں بنا ـــــ کیسے بنا

پاکستان کیوں ٹوٹا ـــــ کیسے ٹوٹا

اب ٹوٹا تو ----------

پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اندھیروں میں اُمید کی ایک کِرن

نقطہ نقطہ میں ـــــ وطن کی محبت

سطر سطر میں ـــــ ایمان کی پاشنی

عمل کا پیغام ----------

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

بقیہ : تہذیبوں کا ٹکراؤ

☆.... کیا آپ کو توقع تھی کہ آپ کا یہ مضمون اس قدر بحث طلب ثابت ہو گا؟

○.... نہیں! میری کسی تحریر پر کبھی اس قدر بحث مباحثہ نہیں ہوا۔ میرے نزدیک اس کا ایک سبب بھی ہے۔ میرے ایک اچھے دوست' فرانسس فکویاما نے پانچ سال قبل ایک مضمون "دی اینڈ آف ہسٹری" لکھا تھا جسے بہت زیادہ شہرت ملی۔ مگر لوگوں نے جب اسے پڑھا تو یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ آزاد جمہوریت واقعتاً فتح یاب ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس میرے خیال میں میرے مضمون پر لوگوں کا ردعمل محتاط ہے آدمی سوچتا ہے کہ کہیں یہ بات سچ ہی ثابت نہ ہو جائے۔○○

(شکریہ نیوز ویک' نومبر ۲۱' ۹۴)

بقیہ : مکتوب کراچی

قائم نہیں ہوا تھا اور اب جو تین نئے اضلاع اس پر مستزاد ہوں گے تو عوامی نمائندوں بے چاروں کا حال جیسا بھی ہو گا اس کا تصور بہت آسان ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک کے بگڑتے ہوئے حالات صرف اس صورت میں سدھر سکتے ہیں کہ عوام کے مینڈیٹ کا احترام کیا جائے۔ ہر پارٹی کو اس کا رول ادا کرنے دیا جائے۔ اگر یہ نہیں کیا جاتا تو آج صرف مہاجر صوبے کی بات ہو رہی ہے' کل کلاں کو سندھو دیش کے نقش قدم پر مہاجر دیش کا نعرہ بھی لگ سکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا وقت آیا تو جو اقتدار میں ہیں وہ بھی غور کریں اور دوسری سیاسی جماعتیں بھی سوچیں کہ وہ کون سا سیاسی میدان ہو گا جس میں فاؤل پلے کے ذریعے وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں گی۔

اب آیئے ایک دوسرے نکتہ کی طرف۔ اگر صوبہ سندھ کی تقسیم کو کوئی پارٹی مفید سمجھتی ہے تو وہ اسے دوسرے صوبوں کے لئے مفید کیوں نہیں سمجھتی۔ ایک طرف تو یہ شکوہ کیا جاتا ہے کہ دیہی اور شہری آبادی میں فرق ہر صوبہ میں موجود ہے لیکن دوسری طرف کوٹہ سسٹم صرف صوبہ سندھ کے شہری علاقوں پر ہی کیوں؟۔ ہمارے سندھی بھائی بھی' اگر دوسرے صوبوں میں مزید تقسیم کی بات نہ کی جائے' تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایسا صرف صوبہ سندھ میں کیوں؟۔ اگر ایم۔ کیو۔ ایم متحدہ قومی موومنٹ پر یقین رکھتی ہے تو وہ یہ ایشو ملکی سطح پر کیوں نہیں رکھتی' صرف مہاجر صوبے کی بات کیوں کرتی ہے؟۔ مزید برآں کیا صرف ایم۔ کیو۔ ایم کے آواز بلند کرنے سے ملک میں صوبوں کی مزید تقسیم ممکن ہے' ایسا بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم چاہے لاکھ دعویٰ کرے' ایک قومی جماعت نہیں کیونکہ اس کا وجود مؤثر طور پر صرف کراچی اور حیدر آباد تک محدود ہے۔ جب تک ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں اس مسئلہ پر متفق نہیں ہوتیں ایسا ممکن نہیں۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر پاکستان میں اقتدار میں شرکت کے بارے میں محروم طبقوں کے احساسِ محرومی کو دور کرنا ہے تو چھوٹے صوبے بنانے پڑیں گے' لوکل سیلف گورنمنٹ قائم کرنی پڑے گی۔

ہم نے صوبوں کو صرف اس لئے تقدس کا درجہ دے رکھا ہے کہ انگریز انہیں قائم کر گیا تھا۔ جس طرح ہم نے انگریزوں کے قانون کو سینے سے لگا رکھا ہے' اسی طرح صوبوں کی تقسیم کا معاملہ بھی ہے۔ ہمارے پڑوس میں بھارت موجود ہے جس کا پنجاب ہمارے پنجاب سے چھوٹا ہے لیکن تین صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ افغانستان کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے لیکن وہاں صوبوں کی تعداد ہمارے ملک سے دس گنا زیادہ ہے تو آخر انتظامات کو احسن طریقے سے چلانے کے لئے چھوٹے صوبے کیوں نہ بنائے جائیں۔

ایک اور مسئلہ جسے خواہ مخواہ اہمیت دے دی گئی ہے' یہ ہے کہ صوبوں کی تقسیم لسانی بنیاد پر نہ ہو بلکہ انتظامی بنیاد پر ہو۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اس وقت پاکستان میں صوبوں کی بنیاد لسانی نہیں؟ جہاں جس زبان کے بولنے والوں کی اکثریت ہے' صوبہ کا نام اسی کے حوالے سے رکھا گیا ہے۔ البتہ جب وہاں حق تلفیاں ہوئی ہیں تبھی وہاں کے حالات خراب ہوئے۔ بلوچستان میں بلوچ پشتون جھگڑا کیوں ہے؟ پنجاب میں سرائیکی صوبے کی آواز کیوں اٹھ رہی ہے؟ اس کے باوجود اگر کوئی لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان جھگڑوں کو ختم کرنا نہیں چاہتا۔ ایک بات اور بھی ہے۔ جہاں سندھی رہتے ہیں وہ صوبہ سندھ کہلا سکتا ہے۔ جہاں پنجابی رہتے ہیں وہ صوبہ پنجاب کہلانے کا حق دار ہے۔ جہاں بلوچ رہتے ہیں اس صوبہ کا نام بلوچستان ہو سکتا ہے لیکن جہاں پشتون آباد ہیں اس صوبہ کا نام پختون خواہ نہیں ہو سکتا۔ مبادا کہ یہ پختونستان کا پیش خیمہ بن جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سندھ میں جئے سندھ کی علیحدگی پسند تحریک موجود نہیں' کیا بلوچستان علیحدگی پسندوں سے خالی ہے؟۔ اگر نہیں ہے اور واقعتاً نہیں ہے تو صوبہ سرحد کا نام پختون خواہ نہ رکھ کر سیاسی کشیدگی کا ماحول برقرار رکھنے میں کون سی حکمت کار فرما ہے؟ یہ وہ باتیں ہیں جن پر ہمارے سیاست دانوں کو بھی غور کرنا چاہئے اور اہل وطن کو بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ پاکستان کو سیاسی استحکام نصیب ہو۔○○

بقیہ : حدیث امروز

نہیں لگاتا بلکہ اس مغرب کے لئے بھی اب سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جسے مسلمان حکمران اپنا مربی و محافظ اور اپنی قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ کاسابلانکا کانفرنس میں یہ معاملہ یوں طشت از بام نہ ہوتا تب بھی ساری دنیا جانتی ہے کہ "بنیاد پرستی" نے ہر مسلمان ملک میں حکمران طبقے کی نیندیں اڑا رکھی ہیں تاہم بنیاد پرستوں کی دہشت گردی کو وہ غنیمت جانتے ہیں جو انہیں سفاکانہ تشدد کا جواز فراہم کر کے "گربہ کشتن روز اول" کا موقع دے دیتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلامی انقلابی تحریکوں کی رہنمائی کا کوئی خصوصی انتظام فرما دیں تاکہ منہج انقلاب نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے تصادم کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے ہر جگہ اس کی ضروری تیاری مکمل کرنے کی فکر کی جائے۔○○

بقیہ : صورت احوال....

پاکستان کی سرزمین پر قرآن و سنت کی حکمرانی ہو گی۔ اس پیمان کو ہماری طرف سے قائد اعظم' خان لیاقت علی خان شہید اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خدا اور قوم اور دنیا کے سامنے پکار کر بیان کیا تھا۔ اس سلسلے میں عوام کے شور مچانے پر قرارداد مقاصد تو پاس ہو گئی لیکن ہمارے اکابر اور عوام نے یہ کوشش نہ کی کہ وہ قرارداد برگ و بار لائے۔

بزرگو! جوانو! عزیزو! اور خواتین! اب جبکہ ایک خوفناک عذاب سر پر لٹک آیا ہے آپ سے درخواست گزار ہوں کہ آپ سب متذکرہ پیمان کو دل میں تازہ کریں' اسلام سے وفاداری اختیار کریں اپنے معاملات خدائے بزرگ و برتر اور اس کے رسولؐ برحق کے احکام کے تابع کریں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے قوم یونس کی طرح گڑگڑا کر پچھلی کوتاہیوں کی معافی مانگیں اور اس کی تلافی کا وعدہ کریں' آنے والی تباہی سے بچنے کی یہی ایک شکل اب باقی نظر آتی ہے۔○○

رابطۂ عوام کی ایک مہم

رپورٹ : محمد طفیل گوندل

تنظیم اسلامی حلقہ راولپنڈی/شمالی پنجاب کے ناظم جناب شمس الحق اعوان صاحب دو رفقاء کی معیت میں رابطہ مہم کے دوسرے دورہ پر ۲۳ نومبر ۹۴ء کو ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہوئے جہاں ان کا ماہانہ درس قرآن کا پروگرام بعد نماز عصر ایک مقامی مسجد میں پہلے سے طے تھا۔ یہ درس قرآن ہمارے ایبٹ آباد کے رفیق تنظیم جناب ہارون قریشی کی سعی کا نتیجہ ہے۔ یہ مختصر سا قافلہ واہ سیمنٹ فیکٹری کی کالونی میں تنظیم کے رفیق سلیم صدیقی صاحب کو ملتے اور ہری پور میں اپنے دو رفقاء تنظیم کو اگلے دن کے پروگرام سے مطلع کرتے ہوئے عین عصر کی نماز سے ۱۵ منٹ پہلے ایبٹ آباد اس وقت پہنچا جب یہ شہر برفانی ہواؤں کی لپیٹ میں گھرا ہوا مختلف مساجد میں اذان کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق نماز عصر کے بعد شمس الحق اعوان صاحب نے درس قرآن دیا جو نماز مغرب تک جاری رہا۔ سورۂ بقرہ کے پہلے رکوع کے ترجمہ اور تشریح کے بعد انہوں نے مختلف زاویوں سے نظام عدل و قسط کے قرآنی فکر کو اجاگر کرتے ہوئے وضاحت کی کہ بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے سے' جس کے نتیجے میں ایمانی کیفیات دھندلانے لگتی ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس زنگ کا علاج موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ شرکاء درس کی تعداد ۱۰ تھی جن میں ہمارے ایک رفیق تنظیم جناب محمد اشرف صاحب تھے جو حال ہی میں صومالیہ سے واپس آئے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے معاون تحریک خلافت جناب ذوالفقار علی صاحب تھے جنہوں نے بعد میں تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اب ایبٹ آباد میں رفقاء کی تعداد تین ہو گئی ہے۔

شام ساڑھے چھ بجے ہم مانسہرہ کے لئے عازم سفر ہوئے۔ اپنے اس دورہ میں مانسہرہ کے رفقاء کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان ملاقاتوں کا مقصد تو باہمی ربط و ضبط بڑھانا اور محبت قلبی میں اضافہ کرنا ہے لہٰذا مانسہرہ میں ڈاکٹر اورنگ زیب صاحب سے ملاقات کی اور رات تنظیم کے دفتر میں بسر کی۔ اگلے دن صبح دوسرے رفیق شفیق الرحمٰن سے مل کر اور ہینڈبل تقسیم کرتے ہوئے دس بجے ہری پور کے لئے روانہ ہوگئے۔ راستے میں قلندر آباد میں رفیق تنظیم محمد انور صاحب سے ملاقات کرتے ہوئے ہم نے مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے ہری پور میں جناب عبدالعزیز کے گھر پر دستک دی' جہاں پر مغرب کی نماز کے بعد درس قرآن کا پروگرام تھا۔ اس محفل میں پانچ رفقاء تنظیم کے علاوہ اور کوئی فرد باہر سے نہیں تھا ان رفقاء میں ہری پور سے عبدالعزیز صاحب اور جناب آصف' راولپنڈی سے شمس الحق اعوان' جمیل احمد صاحب کے علاوہ راقم بھی تھا لہٰذا شمس الحق اعوان صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ہر ایک باری باری قران مجید میں سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق چند آیات کا ترجمہ تشریح اور تفسیر بیان کرے چنانچہ سب نے باری باری عشاء تک قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رات عبدالعزیز صاحب کے ہاں بسر کی اور اگلی صبح یعنی ۲۵ نومبر ۹۴ء بروز جمعہ المبارک چھ ساتھیوں کا ایک قافلہ (تین رفقاء ہری پور سے اور تین رفقاء راولپنڈی سے) ترکھان موہرہ گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ گاؤں ہری پور اور حسن ابدال کے درمیان بڑی شاہراہ سے ہٹ کر ساڑھے پانچ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں پر ابوظہبی سے چھٹی پر آئے ہوئے رفیق تنظیم خورشید صاحب نے جمعہ کے خطاب کے لئے جناب شمس الحق اعوان صاحب کو مدعو کیا ہوا تھا۔ چھوٹا سا یہ گاؤں دامن کوہ میں مٹروں کے سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع ہے جس کی آبادی چند سو نفوس پر مشتمل ہے۔ گاؤں کی تقریباً نصف آبادی پڑھے لکھے نوجوانوں کی ہے۔ خطاب جمعہ میں شمس الحق اعوان صاحب نے سورۂ بقرہ کی آیات "واذقال ربک للملئکہ انی جاعل فی الارضی خلیفہ" اور سورۂ نور کی آیات "وعد اللہ الذین امنوا...." کی روشنی میں نظام خلافت کے خدوخال وضاحت سے بیان فرمائے اور موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے اس بات پر زور دیا کہ صادق المصدوق آنحضور ﷺ کی پیش گوئیوں کے مطابق غلبہ اسلام پورے کرۂ ارضی پر ہو کر رہے گا جس کے لئے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق جدوجہد کرنا فرض ہے اور اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے ہمیں اپنے جان و مال کھپا دینے چاہئیں۔ نماز جمعہ میں آئے ہوئے لوگوں میں حافظ محمد اسماعیل صاحب نے جن کا تعلق قریبی گاؤں موضع بھیڈیاں سے ہے تنظیم اسلامی میں شمولیت کا ارادہ کرلیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم ترکھان موہرہ سے کامرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہاں پر نماز مغرب کے بعد ایک رفیق تنظیم کے گھر پر درس قرآن کا پروگرام طے پایا تھا۔ ایک بندہ مومن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبہ اخروی میں کامیابی ہے' اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے جو بھی اعمال کئے جائیں ان کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔

الحمدللہ اس سفر کے دوران اللہ تعالیٰ کی خاص مدد شامل حال رہی اور ہم ہر مقام پر وقت معین پر پہنچے۔ کامرہ میں بھی مغرب کی نماز سے چند منٹ پہلے پہنچ گئے۔ نماز ادا کرنے کے فوراً بعد درس قرآن کا آغاز کر دیا۔ اس درس میں سات افراد نے شرکت کی جن میں کامرہ کے ہی ایک اور رفیق تنظیم اور حسن ابدال سے جناب سجاد حسین صاحب تشریف لائے تھے۔ شمس الحق اعوان صاحب نے سورۂ نحل کی آیت نمبر ۲۶ "وضرب اللہ مثلا رجلین احدھما ابکم لا یقدر..." کی روشنی میں غلبہ دین حق کے لوازم' جہاد مع النفس' جہاد بالقرآن اور جہاد فی سبیل اللہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ جب دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو کشاکش اور تصادم محض باطل نظریات سے نہیں بلکہ باطل کے علمبرداروں اور باطل کی قوتوں کے ساتھ ہو گا۔ اس لئے کہ وہ اس راستے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ ہر نظام باطل کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے طبقات کے ہاتھوں میں ملک کے معاملات کی زمام کار ہوتی ہے۔ کفار مکہ کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ وہ کبھی بھی یہ گوارا نہ کرسکتے تھے کہ وہ رائج نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں مٹا کر دین کا نظام مکمل طور پر قائم کردیں چنانچہ ان کے ساتھ لازماً پنجہ آزمائی کرنی پڑی۔ اس پنجہ آزمائی میں پھر اپنے اور بیگانوں کی تمیز نہیں رہتی بلکہ اپنوں پر پہلے وار کرنا پڑتا ہے۔ عشاء کی نماز تک یہ درس جاری رہا۔ نماز ادا کرنے کے بعد ٹھیک سوا بجے یہ قافلہ اپنے ان بھائیوں سے جدا ہوا جو نفرت کے لامتناہی اندھیروں میں محبت کے چراغ ہاتھ میں لے کر ہمیں رخصت کر رہے تھے۔OO

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

اگلی صدی تہذیبوں کے ٹکراؤ کی صدی ہوگی

ایک مغربی دانشور کی غور طلب باتیں

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

ہارورڈ یونیورسٹی کے جان ایم اولن (John M.Olin) انسٹی ٹیوٹ برائے سٹریٹجک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر' سموئیل ہنٹنگٹن بحرانوں کو پہلے سے بھانپ لینے کا بڑا شہرہ رکھتے ہیں۔ گذشتہ سال ان کا ایک مضمون "دی کلیش آف سولائزیشنز" (تہذیبوں کا ٹکراؤ) شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سرد جنگ کے دوران نظریاتی بنیادوں پر جاری رہنے والی محاذ آرائی کی جگہ اب ایک نئی قسم کی دھڑے بندی جنم لے رہی ہے جو دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے حوالے سے نہایت تیزی سے وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے خبردار کیا تھا کہ کنفیوشین اسلامی گٹھ جوڑ سے مغربی دنیا کے مفادات' اقدار اور تسلط کو خاص طور پر خطرہ لاحق ہے۔ اس ضمن میں ہنٹنگٹن سے نیوز ویک کی ایک حالیہ گفتگو کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو امید ہے قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا۔

☆.... آپ کا کہنا ہے کہ چین کی معاشی ترقی دنیا میں عدم استحکام کا باعث ہو گی۔ ایسا کیوں؟

O.... تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی طور پر ترقی حاصل کرنے والے ممالک میں اس لحاظ سے اپنا لوہا منوانے کا رجحان بھی پروان چڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک توسیع پسند اور سامراجی ملک کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ چین اپنے آپ کو منوانا چاہے گا۔ مشرقی ایشیاء میں چین دو ہزار سال تک ایک نہایت اہم ملک رہا۔ بعد میں (۱۸۵۰ء سے) مغرب اور جاپان کے زیر نگیں چلا آ رہا ہے جسے چینی اپنے لئے توہین آمیز تصور کرتے ہیں لہٰذا قدرتی طور پر ان کی کوشش ہو گی کہ اپنا کھویا ہوا مقام دنیا میں دوبارہ حاصل کریں۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر موجودہ حالات میں تبدیلی ہو گا جس سے عدم استحکام لاحق ہو گا۔

☆.... کیا عالمی معیشت میں چین کی شمولیت سے بیجنگ کے رویہ میں نرمی نہیں آئے گی؟

O.... ایک لمبے عرصے کے عمل کے نتیجے میں تو نرمی پیدا ہو گی لیکن اس سے پہلے چین اپنا حق منوائے گا۔ چین ابھی ایک کسانوں کا معاشرہ ہے لیکن معاشی ترقی کے جاری رہنے سے اعتدال پسند قوتیں ابھر کر سامنے آئیں گی اور نہ صرف بیرونی معاملات میں چین کا رویہ تبدیل ہو گا' اندرونی طور پر بھی عوام کو اثر و رسوخ حاصل ہو گا۔

☆.... آپ کہتے ہیں کہ کسی ملک کو سیاسی طور پر طاقت ور ہونے کے لئے وہاں ایک مضبوط مشترک ثقافت کا ہونا ضروری ہے جبکہ چین کو اب وہ تشخص حاصل نہیں جو اسے کمیونزم سے پہلے حاصل تھا۔ مثلاً ساحلی شہروں میں' جہاں دولت کی ریل پیل ہے' مادہ پرستی کا زور ہے جبکہ باقی ہر جگہ مذہب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس طرح کا ثقافتی تضاد چین کے دنیا میں مقام حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہو گا؟

O.... رکاوٹ ہو گا۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ دنیا میں ہر جگہ یہ مسئلہ ہے چین کے لئے بھی قومی تشخص کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے' جہاں اب لوگوں کی خاصی بڑی تعداد مذہب کی جانب متوجہ ہو رہی ہے۔ اس کی ایک مثال چین میں عیسائیت کا فروغ ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس کا نتیجہ بالآخر چینی نیشنلزم کی شکل میں برآمد ہو گا جس سے عدم استحکام کے امکانات کو تقویت حاصل ہو گی۔

☆.... تبت اور زنجیانگ جیسے غیر کنفیوشین علاقوں میں علیحدگی پسندانہ رجحانات کیا خود چین کے اندر عدم استحکام کا باعث نہیں ہوں گے؟

☆.... جن علاقوں میں غیر ہن لوگ آباد ہیں وہاں یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ آئندہ یہ مسئلہ شدت اختیار کر جائے اور یوگرز (Uygurs) اپنے کازکستانی بھائیوں سے جا ملیں۔ وسط ایشیاء میں پانچ نئی اسلامی ریاستوں کا قیام چین کے لئے باعث تشویش ہے۔

☆.... آپ نے کنفیوشین اسلامی خطرے سے مغرب کو خبردار کیا ہے لیکن کیا زنجیانگ کے حوالے سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ ان دونوں تہذیبوں کا آپس میں بھی ٹکراؤ ہو سکتا ہے؟

O.... بالکل ہو سکتا ہے۔ البتہ میں نے جس آپس کے گٹھ جوڑ کی بات کی ہے وہ چین سے جنگی ہتھیاروں کی مسلم ممالک کو منتقلی سے متعلق ہے۔ باقی وسط ایشیاء اور بعض دوسری جگہوں پر ان دونوں قوموں میں تصادم عین ممکن ہے۔

☆.... کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب سب کا مشترک دشمن رہے گا؟

O.... کنفیوشین اور اسلامی دونوں گروہ مغرب کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں۔

☆.... یعنی "زرد خطرہ" اٹل ہے۔ مغرب کا جنگجو طبقہ آپ کے دلائل سے زور نہیں پکڑے گا؟

O.... یہ دنیا ایسی نہیں ہے کہ اس میں صرف امن و آشتی کے راگ الاپے جائیں۔ ہم سرد جنگ کے بعد خلیج میں ایک جنگ لڑ چکے ہیں۔ ابھی وہاں مزید فوج بھیجی گئی ہے۔ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور ان کے ذریعے دہشت گردی کا خطرہ موجود ہے۔ یہ باتیں بہرحال سب کے سامنے ہیں۔ ان سے انکار تو نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مخصوص طبقہ جس کے اپنے جنگ سے مفادات وابستہ ہیں وہ انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کر سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر نوع کا تشدد پہلے سے بھی زیادہ عام ہوا ہے۔

☆.... آپ اس نکتہ چینی کے جواب میں کیا کہیں گے کہ آپ کا مضمون ضرورت سے زیادہ کھل گیا ہے؟

O.... جب ہم دنیا کے معاملات پر غور شروع کریں گے تو اس کے لئے کوئی واضح تصور تو اختیار کرنا پڑے گا۔ سرد جنگ کے دوران آزاد ممالک' کمیونسٹ بلاک اور تیسری دنیا کے بارے میں بالکل ایک دو ٹوک تصور موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۰ء میں روس چین تعلقات میں کشیدگی کے باوجود امریکی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی لہٰذا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی کام کے آغاز میں بعض مفروضے قائم کرنا پڑتے ہیں' جن کی بنیاد پر پالیسیاں مرتب ہوتی ہیں۔ اگر ہم مستقبل کے بارے میں کوئی دو ٹوک نقطہ نظر اختیار نہیں کریں گے تو محض تعصبات میں گھر کر رہ جائیں گے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)